Monthly
Arzang
Lahore

راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کے 25 کامیاب سال

ماہنامہ

ارژنگ لاہور

مدیر اعلیٰ:
عامر بن علی

جنوری ۲۰۲۵ء

مدیران:
حسن عباسی
لبنیٰ صفدر

CamScanner

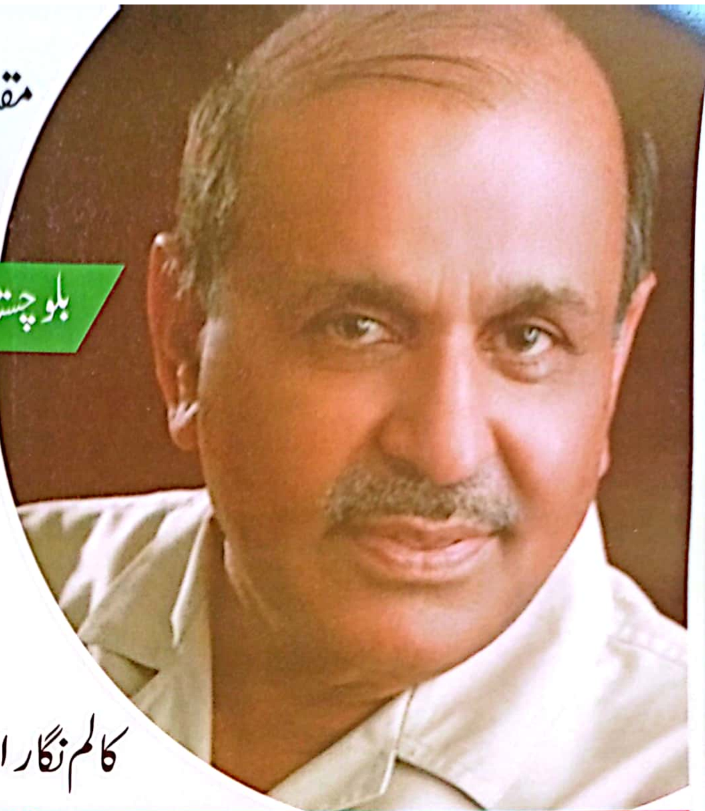

مقتدرہ قومی زبان کی سربراہی کے دوران یہ پیغام دیا کہ ادارہ فقط صدر نشین کا نام نہیں ہے

بلوچستان ایسا صوبہ ہے جہاں ثقافتوں اور زبانوں کا جال بچھا ہوا ہے

مقبول افسانہ نگار، کالم نویس، محقق و معلم اور مقتدرہ قومی زبان کے سربراہ

ڈاکٹر انوار احمد

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر، کالم نگار اور سفرنامہ نگار عامر بن علی کی خصوصی گفتگو

بے شک میں ملتانی ہوں مگر جہاں کہیں بھی اندرون و بیرون ملک گیا اسے درس گاہ خیال کیا

افسانہ نگار، محقق، مترجم کالم نویس و مدیر ڈاکٹر انوار احمد ان چند اہل قلم میں سے ہیں جنہوں نے تمام زندگی ادب کی خدمت کرنے میں گزاری ہے۔ ساری عمر طالب علموں کو الفاظ کی حرمت سکھانے اور زندگی کا شعور دینے میں بسر کی ہے۔ مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین اور دیگر کئی اہم مناصب پر فائز رہے مگر اپنا تعارف ہمیشہ ایک استاد کے طور پر کرنے میں نازاں اور مصر رہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت کم ان جیسے اساتذہ دیکھے ہیں جنہیں معلم ہونے پر نا صرف فخر ہو بلکہ اسے مقدس فرض سمجھتے ہوں۔

س ابتدا سے بات کا آغاز کرنا چاہوں گا۔ کہاں پیدا ہوئے؟ بچپن کہاں گزرا؟ گردو پیش کے حالات کیسے تھے؟

ج میں ملتان میں پیدا ہوا قیام پاکستان سے کوئی آٹھ ہفتے پہلے (11 جون 1947) میرے دادا جھنڈا محمد کہا جاتا ہے کہ ضلع ہوشیار پور کی تحصیل سبھو وال سے قیام پاکستان سے ڈیڑھ دو عشرے پہلے ڈاکخانے کی ملازمت کرتے تھے۔ پہلے وہ جیل خانے میں ملازم ہوئے پھر سب پوسٹ ماسٹر ہوگئے گویا وہ میٹریکولیٹ تو ہوں گے۔ میرے دادا کے چار بیٹے اور چار بیٹیاں تھے ان کے پہلے دولڑکے شادی سے پہلے فوت ہوگئے اس لئے میرے تایا مشتاق احمد اور پھر میرے والد مختار احمد تھے ان دونوں نے بھی دسویں تک تعلیم پائی تھی میری دادی غلام فاطمہ کو میں نے اپنے ہم مکتبوں سے سنا کہ وہ کسی سکھ کی بیٹی تھیں جو ظاہر ہے مسلمان ہوگئی تھیں۔ میں نہیں جانتا کہ میرے دادا نے میرے والد کی شادی روایتی ملتانی گھرانے میں کیوں کی؟ میری ماں بیگم بی بی نے تعلیم نہیں پائی تھی مگر ان کا رنگ گورا تھا ممکن ہے کہ میرے دادا اپنے کنبے کے کالے رنگ کو بدلنا چاہتے ہوں میرے نانا حسین بخش کی تعلیم تو شاید مسجد مکتب کی تھی مگر ان کے گھر میں کتابوں کا ذخیرہ تھا، وہ شکار، سیاحت اور شاید شاہد پرستی کا شوق رکھتے تھے اس لئے موسیقی سے واقف تھے اور میری نانی (دولت بی بی)

ایک دو معروف مغنیاؤں یا طوائفوں کا نام لے کر روتی رہتی تھیں، وہ کہتی تھیں کہ اس شخص نے ہزاروں کمائے اور سب کے سب اسی بازار میں لٹائے۔ میرے نانا کی بعض وکیلوں سے بھی دوستی تھی اس لئے مقدمہ باز کی شہرت تھی اور بعض لوگ انہیں اسی حوالے سے حضرت جی کہتے تھے۔ وہ قیام پاکستان سے پہلے ڈسٹرکٹ بورڈ کی وائس چیئرمینی کے لئے گیلانی خاندان کے کسی بڑے کے مقابلے میں الیکشن میں کھڑے ہوگئے، ہار گئے مگر شاید اسی کی وجہ سے قتل کا مقدمہ بنا اور کسی انگریز ''منصف'' نے نقد پیسے شراب کی چار بوتلوں اور پھلوں سے بھری ہوئی ٹوکری (جسے ڈالی کہتے تھے) لے کر مقدمہ خارج کیا۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

CamScanner

راوی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کے 25 کامیاب سال

ماہنامہ ارژنگ لاہور

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

MONTHLY Arzang LAHORE

جنوری 2025ء جلد 26 شمارہ 1

مدیر اعلیٰ
- عامر بن علی

مدیران
- حسن عباسی
- لبنیٰ صفدر

مجلس ادارت
- ڈاکٹر جعفر حسن مبارک
- سعدیہ سیٹھی

مجلس مشاورت
- ظفر خان (آسٹریلیا)
- ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ: زرناب کمپوزنگ 0321-4730769

فوٹوگرافر: نعمان حسن 0333-4918383

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0300-4489310

سالانہ ممبرشپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے نام اور شناختی کارڈ نمبر پر مبلغ -/1500 روپے بذریعہ موبی کیش رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔

حسن محمود: 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر: 31204-7298386-9

فہرست

حمد و نعت ' 2

گوشۂ نعت: عبدالقیوم زائر ' 3

مضامین:

- غالب تخلیقی معنویت کا روشن استعارہ / ڈاکٹر اسلم انصاری ' 4
- سندھی ادب کا اجمالی جائزہ / مرزا کاظم رضا بیگ ' 8
- خوبصورت مساجد از فقیر اللہ خاں / لبنیٰ صفدر ' 10
- احمد ندیم رفیع آج اور کل کا شاعر / حسن عباسی ' 12
- عالمی سطح پر اردو زبان کا بڑھتا رجحان / ثوبیہ شاہ ' 14
- انجینئر ظفر محی الدین کی "درویش" اور درویشیت / عبدالوحید بسمل ' 21
- بیانیہ اور پاکستانی بیانیہ / ڈاکٹر سائرہ بتول ' 23
- محمد امین ساجد سعیدی کی نعت / ڈاکٹر احسان اللہ طاہر ' 25

شعری گوشے: زاہد محمود زاہد ' ڈاکٹر اسد نصیر ' 27 تا 28

خاکہ:

- بھلایا نہ جائے گا / ڈاکٹر علی محمد خاں ' 29

سفرنامے:

- سالِ نو اور جاپان / عامر بن علی ' 34
- سمرقند اور تیمور لنگ / سرور غزالی ' 35

بقیہ انٹرویو: ڈاکٹر انوار احمد ' 36

بقیہ انٹرویو: نوید مرزا ' 37

طنز و مزاح:

- لیلیٰ کی سہیلی / وحید الرحمٰن خان ' 39
- شاعروں کے تخیلات پر کچھ ادبی اجتہاد / امجد محمود چشتی ' 41
- کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تصویریں / پروفیسر نور کمال شاہ ' 43

افسانے:

- ساتواں درویش / سید تحسین گیلانی ' 45
- سماج / آسناتھ کنول ' 47
- بھیڑ سے مڈبھیڑ / کلیم خارجی ' 50
- قفس / فائزہ صابری نوا ' 53
- تبصرۂ کتب ' 54
- ادبی خبریں ' 56

Far East Marketing Co.

Samana Mansion 6.5 Koanp-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 108-0003 Japan
Email: femc1@hotmail.com

CS CamScanner

حمد و نعت

حمد

کس کا نظام راہ نما ہے اُفق اُفق
کس کا دوام گونج رہا ہے اُفق اُفق
شانِ جلال کس کی عیاں ہے جبل جبل
رنگِ جمال کس کا جما ہے اُفق اُفق
کس کے لیے نجوم بکف ہے روش روش
بابِ شہود کس کا کھلا ہے اُفق اُفق
کس کے لیے سرودِ صبا ہے چمن چمن
کس کے لیے نمودِ ضیا ہے اُفق اُفق
مکتوم کس کی موجِ کرم ہے صدف صدف
مرقوم کس کا حرفِ وفا ہے اُفق اُفق
کس کی طلب میں اہلِ محبت ہیں داغ داغ
کس کی ادا سے حشر بپا ہے اُفق اُفق
سوزاں ہے کس کی یاد میں تائب نفس نفس
فرقت میں کس کی شعلہ نوا ہے اُفق اُفق

حفیظ تائب

نعت رسول مقبول ﷺ

حریمِ دل میں اب اسمِ محمدؐ کی ہیں تنویریں
چمکتی ہیں نگاہوں میں حسیں طیبہ کی تصویریں
بیاں جن میں ملے سرکارؐ کی توصیف و مدحت کا
نہایت خوشنما لگتی ہیں وہ اُجلی سی تحریریں
حریمِ روضۂ اقدس میں حاضر ہو کے جب میں نے
طلب کی مغفرت، بخشی گئیں سب میری تقصیریں
محبت اور ادب سے جو درِ اقدس پہ آ جائیں
سنور جاتی ہیں پھر لاریب بگڑی اُن کی تقدیریں
جو رکھیں اپنی آوازوں کو اُونچا صوتِ نبویؐ سے
بایں صورت خدا سے پائیں گے وہ سخت تعزیریں
ہر اِک ذرہ ہے طیبہ کا مقدّس نور کا پیکر
عیاں ہوں نور کے عالم اگر ذرّوں کے دل چیریں
نگاہِ عشق میں طیبہ ہے سب فردوس کی صورت
مناظر چار سو آئیں نظر جنّت کی تصویریں
رہے ہر سمت طیبہ میں کبھی محوِ خرام آقاؐ
وہاں موجود ہیں اُنؐ کے نقوشِ پا کی تنویریں
احد ہو یا بقیع ہو یا قبا و مسجدِ نبویؐ
وہاں شمس الضحیٰ کی چار سو پھیلی ہیں تنویریں

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر

عنایت اُنؐ کی یہ مجھ پر بسا اوقات ہوتی ہے
میں اُنؐ کا نام لیتا ہوں، تو خود ہی نعت ہوتی ہے
جڑے رہنا ضروری ہے گلستانِ محمدؐ سے
اِسی گلشن میں رحمت کی سدا برسات ہوتی ہے
صحابہؓ نے کہا: کیسے بیاں ہو گفتگو اُنؐ کی
مہکتی ہے فضا ساری، جب اُنؐ سے بات ہوتی ہے
گواہی دے رہی ہے کہکشاں معراجِ نبویؐ کی
فلک پر خود اُبھر آتی ہے جوں ہی رات ہوتی ہے
کہاں پھولوں کی قسمت میں مہک اُنؐ کے پسینے کی
وہ دنیا میں کہاں! جنت کی جو سوغات ہوتی ہے
میں جب بھی نعت کہتا ہوں بہت سرشار ہوتا ہوں
مجھے لگتا ہے اُنؐ کی خاص رحمت ساتھ ہوتی ہے
وہؐ چاہیں تو پڑھیں کلمہ یہ پتھر بھی محبت سے
نہ اُنؐ کی بات جو مانے، اُسی کو مات ہوتی ہے
تمنا ہے سناؤں نعت جا کر اُنؐ کے روضے پر
مگر اب دیکھیے کیا صورتِ حالات ہوتی ہے

ڈاکٹر ایوب ندیم

ہے نورِ محمدؐ سے منور میرا سینہ
کیا اِس سے بڑا ہو گا زمانے میں خزینہ
وہ رحمتِ عالم ہیں خدا نے یہ کہا خود
اُن کے لیے مرنا میرا ان کے لیے جینا
کیا میرا بگاڑے گی بھلا گردشِ دوراں
ہے پاس میرے اِسمِ محمدؐ کا نگینہ
احمدؐ کے نواسے تو ہیں سردارانِ جنت
اُمت کے لیے ہیں یہ مودت کا خزینہ
مجھ کو ہے بہت ہادیٔ برحق سے عقیدت
اے کاش لگے پار محبت کا سفینہ
حسرت ہے میرے دل کی پہنچ جاؤں مدینے
چڑھتا ہوں یہی سوچ کے ہر بار میں زینہ
ہر لحظہ پکاروں میں یہ ہی نامِ محمدؐ
اِس واسطے رکھا ہے میرے دِل میں خزینہ
رہتا ہے میرے لب پہ فقط نامِ محمدؐ
آتا ہے میرے دل کو محبت کا قرینہ
تاثیر اِسی نام کی برکت ہے یہ ساری
ہے عشقِ محمدؐ سے کُشادہ میرا سینہ

تاثیر نقوی

عبدالقیوم زائرؔ/امریکہ

مرے لب ، تری گفتگو ، آرزو
رہیں ہر گھڑی باوضو ، آرزو

دمِ جاں کنی ہو ، مرے سامنے
تری صورتِ خوبرو ، آرزو

فقیرِ عجم کا وہ زخمِ لگن
ہو میرِ حرمؐ! نے رفو آرزو

ذرا ہم خطاکاروں کی حشر میں
خبر لیجیو ، مہر خوؐ! آرزو

جگا آ کے غفلت زدہ دل مرا
اَے کہ گیسوئے مشک بوؐ! آرزو

ترے آستانے کی ، اللہ رے خیر
رہے ارفع و سرخرو ، آرزو

دل و جاں ، نبیناؐ ! ترے فدا
بڑی آرزو ، آرزو ، آرزو

قسم سے رہے جب پڑھوں مَیں درود
فزوں روشنی چار سُو ، آرزو

تو ذرّہ محبت کا خیرات کر
رقیمِ محبت کہ توؐ! آرزو

اے رحمت لقبؐ! تابِ زائرؔ نہیں
بیاں کر سکے روبرو ، آرزو

غم ترا ہے شوق بھی ، ارمان بھی
مابدولت مرہونِ فیضان بھی

عالمِ خوش رنگ و بو میں ، اے کریمؐ!
تجھؐ سے ، اِس ناچیز کی پہچان بھی

وِردِ لب جب ہو مرے "صلِ علیٰ"
ہم نوا ہو جاتا ہے رحمان بھی

ساتھ چلنے کو مدینے کی طرف
رابطہ میں واقف و انجان بھی

ہو کرم مجھ پر کریماؐ! اس طرح
نعت کا اِک اور ہو دیوان بھی

آپؐ کی نسبت ، ہمیں رب کی قسم
کر گئی ہے محترم ، ذیشان بھی

جب سے لکھنے میں لگا نعتِ رسولؐ
پرسکوں ہے دل مرا بھی ، جان بھی

مدحت و توصیفِ آقاؐ کے حسیں
ہیں میسّر نت نئے عنوان بھی

مے کشِ غفلت ہے زائرؔ، پھر بھی لوگ
جانتے ہیں ، صاحبِ ایمان بھی

غم زدوں کے خیر خواہ صلِ علیٰ
ہیں محمد مصطفیٰ صلِ علیٰ

مرحبا ، صلِ علیٰ کہف الوریٰ
مرحبا ، نور الہدیٰ صلِ علیٰ

آمنہؓ کے لاڈلے نورِ نظر
ہیں امام الانبیاء ، صلِ علیٰ

حضرتِ عبداللہؓ کے لختِ جگر
آپؐ پر عالمؑ فدا ، صلِ علیٰ

آپؐ ہیں حسنینؓ کے نانا ، حضورؐ!
آپؐ ابوؐ الفاطمہؓ صلِ علیٰ

رُخ منوّر ، آنکھیں مستانی ہیں اور
شانوں پہ زُلفِ سیَہ ، صلِ علیٰ

پُشت پر مُہرِ نبوّت جلوہ گر
رُخ پہ شانِ کبریا ، صلِ علیٰ

بعد خالق ، بالیقیں ، مخلوقؑ میں
مرتبہ تیرا بڑا ، صلِّ علیٰ

ہے قریں تر آپؐ کے اک دل نشیں
خلد کا اعلیٰ قطعہ ، صلِّ علیٰ

ہم عجم سے ہیں پناہ گیرِ حرم
آپؐ ہیں عالم پناہ صلِ علیٰ

آپؐ ہوں گے مائلِ جود و عطا
لب پہ زائرؔ! جب ہوا صلِ علیٰ

یا نبیؐ! ہم کو تیری گلی کی طلب
زندگی بھر رہے جان و جی کی طلب

دل کے ظُلمت کدہ میں اے سرکارؐ، اب
ہر گھڑی ہے ہمیں روشنی کی طلب

جس گلی میں ملائک کے پھیرے رہیں
اُس گلی میں ہمیں بندگی کی طلب

جب ٹھکانہ ترے قدموں میں مل گیا
نہ رہی خسروی ، قیصری کی طلب

ہم ہیں اُمت سے ان کی کہ جن سے بڑی
غیروں کو بھی رہی دوستی کی طلب

روزِ محشر کو بھی ، اے شفیعِ اُممؐ!
ہم گنہ گاروں کو آپؐ ہی کی طلب

وقتِ آخر پہ بھی بس ستاتی رہے
در پہ تیرے مجھے حاضری کی طلب

لوٹنے جو لگے پاسباں قوم کو
شہرِ زائرؔ کو پھر ہاشمی کی طلب

غالب، تخلیقی معنویت کا روشن استعارہ

ڈاکٹر اسلم انصاری

مرزا غالب کو ہماری شعریات ہی میں نہیں، ہماری فکریات میں بھی ایک اہم موڑ، ایک نشانِ منزل کی حیثیت حاصل ہے۔ اپنے منفرد شعری اسلوب کے ذریعے انہوں نے ماضی اور مستقبل کے فاصلوں کو کم سے کم کر دیا۔ اگر ایک طرف وہ عرفی اور نظیری کو ہمارے قریب لے آئے تو دوسری طرف انہوں نے بیسویں صدی کے اس ''گلشنِ نا آفریدہ'' کی طرف بھی ہماری رہنمائی کی جو ہمارے شعر و ادب کا سب سے زریں باب ثابت ہونے والا تھا۔ وہ انیسویں صدی کے برصغیر میں مسلم تہذیب کی واحد تخلیقی علامت تھے۔ جو اس عہد کے ہولناک خلا کو اپنی درخشاں خلاقی سے پر کرتی دکھائی دیتی ہے، اردو شاعری کے یاس پسندانہ اور عمومی طور پر انفعالی رویوں کی انتہا پر ان کی توانا آواز ایک نئے عہد کی نقیب ثابت ہوئی، ان کی ترکمانیت اور غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں نے شاعری اور تہذیب، دونوں کو زندگی کی حرارت اور جرأتِ عمل کا اشارہ دیا، اگرچہ ان کی شاعری ان کی ذاتی محرومیوں کا نوحہ بھی ہے اور ایک عمیق اور فلسفیانہ تصورِ غم کی آئینہ دار بھی، لیکن ان کی جستجوئے نشاط اور آرزوئے حیات ان کے پیمانۂ غم سے بار بار چھلک جاتی ہے، اگر جستجوئے نشاط میں وہ زوال آشنا اور انحطاط پذیر مغلیہ تہذیب کے ترجمان ہیں، تو آرزوئے حیات میں وہ برصغیر کے مسلمانوں کی بیدار ہوتی ہوئی تخلیقی امنگوں کا علاماتی مظہر بھی ہیں، اسی لئے انہیں بجا طور پر قدیم و جدید کا سنگم قرار دیا جا سکتا ہے، ایک ایسا سنگم جس کا زیادہ حصہ جدید امکانات کی آرزو اور ان کی تلاش اور شناخت کے عمل سے عبارت ہے۔

زندگی میں معانی کی تلاش جسے ایک سطح پر مابعد الطبیعاتی تلاش (Metaphysical Quest) بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ دراصل قدیم فلسفیانہ اور متصوفانہ تصورات میں حیات بخش عناصر کی تلاش تھی جو کہنہ اور فرسودہ عقلی تصورات کی جگہ لے سکے۔ تخلیقی سطح پر ایک نئے جہانِ معنی کی تخلیق حیات و کائنات کی نئی عقلی تشریحات کی ضرورت کو بھی واضح کرتی ہے، مجموعی طور پر ان کا پیغام یہی ہے کہ زندگی کو ایک نئے انداز سے دیکھنا اور محسوس کرنا چاہئے، بلکہ بعض اوقات وہ زندگی میں ایک فوری اور اساسی تبدیلی کی شدت سے خواہش کرتے دکھائی دیتے ہیں، ایک ایسی تبدیلی جو زندگی کو نئی فکری اور جمالیاتی اساس فراہم کر سکے۔ ان کی اس خواہش کا اظہار ان کی اُردو شاعری میں رمز و کنایہ کی زبان میں ہوا ہے، لیکن اس کا بھرپور اظہار ان کی بعض فارسی غزلوں میں نظر آتا ہے۔ اردو شاعری میں تبدیلی کی توقع، اور تبدیلی کے وقوع پذیر نہ ہونے کا احساس کئی انداز میں ظاہر ہوا ہے۔ مثلاً ایک اردو غزل کے دو شعر اس حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں۔

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال!
ہیں ورق گردانیٔ نیرنگ یک بُت خانہ ہم
باوجودِ یک جہاں ہنگامہ، پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

پہلے شعر میں شاعر نے خود کو تغیر کے ایک عمل کے مترادف فرض کر لیا ہے۔ لیکن وہ تغیر کتاب کی ورق گردانی کا تغیر ہے، اس شعر میں بت خانہ سے مراد مرقعِ تصاویر ہے جو نگارانِ خوش ادا کی تصویروں سے عبارت ہے، اگر ایسے کسی مرحلے کو تصور میں لا کر خیال ہی میں اس کی ورق گردانی کریں تو محسوس ہو گا ایک کے بعد ایک محفل برہم ہوتی جا رہی ہے۔ (شعر میں فرض کیا گیا ہے کہ ایک تصویر ایک بزم ہے) خیال کو اس شعر میں گنجفہ باز قرار دیا گیا ہے۔ گنجفہ سے مراد تاش کے پتوں کا کھیل ہے، غالب کے استعارے میں خیال (تخیل) کا گنجفہ باز، تاش کے پتوں کو، جن پر تصاویر بھی فرض کی گئی ہیں، مسلسل درہم برہم کرتا رہتا ہے۔ غالب نے اس شعر میں استعارے کی سطح پر دو مساواتیں قائم کی ہیں اپنے آپ کو اپنے تخیلی عمل کے مساوی قرار دیا ہے اور اپنے تخیلی عمل کو ایک مرقع تصاویر کی ورق گردانی سے تعبیر کیا ہے۔ اہل نظر سے یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ گو غالب خود کو ایک عمل تغیر میں تحلیل کر رہے ہیں۔ تاہم یہ تغیر تکرارِ معنی کا مظہر ہے۔ یہ اوراق مصور کا تغیر ہے جس میں ارتقاء اور حقیقی تبدیلی کا اصول کارفرما نہیں، بلکہ محض ایک خیالی تبدیلی ہے۔ ایک انحطاط پذیر اور جمود کے شکار معاشرے کی اس سے خوبصورت تصویر شاید ہی ممکن ہو۔ مرقع تصاویر کی ورق گردانی، تصاویر کی ماہیت کو تبدیل نہیں کر پاتی۔ خود تصاویر بھی ورق گردانی کے عمل تحرک کے باوجود بے جان تصاویر ہی رہتی ہیں، ایک انحطاط پذیر معاشرے میں بھی تبدیلیاں واقع ہو سکتی ہیں، لیکن یہ تبدیلیاں اندرونی جمود کو نہیں توڑ پاتیں، اس لئے کہ ان میں تغیر کا حقیقی اصول کارفرما نہیں ہوتا، دوسرا شعر بھی اسی حقیقت کو ایک نئے پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ باوجود یکہ ہنگامہ ''بہ مقدار یک جہاں'' ہے، لیکن رونما کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ کیا یہ لال قلعے کے ان

ہنگامہ ہائے نشاط کی تصویر نہیں، جن کے نتیجے میں کوئی تاریخی تبدیلی رونما ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ یہاں بھی غالب نے خود ہی کو ایک ایسا ہنگامہ یا اس ہنگامے کا ظرفِ مکانی قرار دیا ہے جس سے حقیقی رونمائی (Emergence) کا ثمرہ حاصل ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ گویا ہم (غالب) ایک پروانے کے دل کا شبستان ہیں جو (روشنی کی آرزو) سے چراغاں کیا گیا ہے۔ علاماتی طور پر اس شعر میں ''یک جہاں ہنگامہ'' نئی زندگی اور نئی اجتماعیت کی آرزو ہے، اور ''پیدائی نہیں'' عہدِ غالب کا تاریخی خلا ہے جسے ۱۸۵۷ء کے سرفروشانِ آزادی نے اپنے خونِ گرانمایہ کی سرخی سے پر کرنے کی کوشش کی لیکن یہ سرخی بھی پروانے کے باطن کے شبستان کا چراغاں ہی ثابت ہوئی۔ جو روشنی نہیں، بلکہ روشنی کی آرزو سے عبارت ہے۔ بہادر شاہ ظفر کا لال قلعہ بھی اپنے باطن میں چراغانِ شبستانِ دل پروانہ ہے یا شاید وہ بھی نہیں، بلکہ صرف اس کی ایک تمثیل ہے، لیکن غالب کو اپنے عہد سے جو معنوی تعلق ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنی ذاتی بے سروسامانی اور اپنے عہد کی بے سروسامانی میں ایک گہرا علاماتی رشتہ محسوس کرتا ہے، لیکن ذاتی طور پر وہ اپنے عہد کی آرزوئے تغیر کی تجسیم ہے، ایسا تغیر جو وقوع پذیر نہیں ہو رہا۔ وہ اپنی تہذیب کا ایک ایسا امکان ہے جس کی پہلی نشانی وہ خود ہے، اس لئے وجودی سطح پر اس کی تہذیب اور اس کی ذات کے درمیان بظاہر کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔ اس لئے اس کا یہ قول قرینِ حقیقت ہے کہ

نہ گلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

اس شعر میں بھی خواہشِ تغیر اور عملِ تغیر کا ایک انوکھا ملاپ دکھائی دیتا ہے ساز وہ ہے جس کے پردے (سریں) ہوں، اور اس سے نغمے پھوٹتے ہوں (نغمے جو پھول بن کر بکھرتے ہوں) لیکن جب ساز ہی نہ رہے تو اس سے آواز کی صرف ایک ہی صورت پیدا ہو سکتی ہے، شکست کی آواز اس خیال کو مرزا نے ایک فارسی شعر میں اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا ہے:

نماند سازِ مرا ہیچ نغمہ ہم نفسان
جز آنکہ برشکنندش چو در نوا آرند

(میرے ساز میں اب اس کے سوا کوئی نغمہ باقی نہیں رہا کہ جب اسے بجانے لگیں تو اسے توڑ ڈالیں) تبدیلی کے معنی خیز اور با اثر نہ ہونے کے احساس کو غالب نے کئی انداز سے بیان کیا ہے مثلاً ایک شعر میں نالۂ دل کو ایک رات کے پس منظر میں بے اثر فرض کیا ہے، اس کی تڑپ اور بے تابی کو دانۂ سپند کی تڑپ کے مشابہ قرار دیا ہے لیکن یہ تڑپ اس لئے بے اثر ہے کہ دانۂ سپند ''بزمِ وصلِ غیر'' میں جل کر تڑپ رہا ہے۔ ذاتی سطح پر ''یہ بزمِ وصلِ غیر'' وہ لال قلعہ ہے جس میں ملک الشعرائی کا منصب غالب کو نہیں بلکہ ذوق کو حاصل ہے، اس لئے غالب اپنے سوز و گداز اور اپنی تخلیقی تڑپ کا جو تماشا بھی تہذیب دہلی کی علامت یعنی لال قلعے میں دکھائیں وہ اثر خیزی سے محروم ہی رہے گا، اس لئے کہ یہ ''دانۂ سپند'' کی ''بزمِ وصلِ غیر'' میں بے سود تڑپ ہوگی، شعر یہ ہے!

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر، گو بے تاب تھا!

اس غزل کے ایک شعر میں اسباب کائنات کی فراوانی اور اپنی کم کوشی پر افسوس کیا ہے، اور اپنے جنون کو ''جنونِ نارسا'' قرار دیا ہے، جنونِ نارسا کی ترکیب بھی دراصل اجتماعی قوتوں کی نارسائی کا استعارہ ہے:

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے، ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا!

اس شعر میں کائنات کے حسن کا قرار کیا گیا ہے۔ کائنات کے حسن کا یہی ادراک اور اقرار ہی ہے جو غالب کو زندگی اور حیات پسندی کا شاعر بناتا ہے اور عہد کی تخلیقی ویرانی کی تلافی کرتا ہے، غالب کو لا شعوری طور پر اس بات کا احساس تھا کہ وہ اپنے تخلیقی مضمرات کے حوالے سے جس تمدنی تبدیلی کے آرزو مند ہیں وہ فوری طور پر وقوع پذیر نہیں ہو سکتی، بلکہ فوری طور پر تو اسے ایک ''محالِ تاریخی'' (Historical Impossibility) ہی قرار دیا جا سکتا ہے، اسی لئے ان کے ہاں امرِ محال اور عملِ محال کی کئی تصویریں اپنی محالاتی (Paradoxical) صورت میں دکھائی دیتی ہیں ایک شعر میں کہتے ہیں:

شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں!

تارِ نگاہ یوں بھی ایک غیر مرئی چیز ہے، اگر وہ تارِ نگاہ کسی پیکرِ تصویر کی آنکھ کا تارِ نگاہ ہو تو اس کا وجود صرف خیالی اور تجریدی ہی رہ جاتا ہے، غالب کا یہ کہنا کہ میرا شوق (آرزوئے حسن و حیات) مجھے ایک ایسے صحرا میں دوڑا رہا ہے جہاں کوئی راستہ ہی نہیں، راستہ ہے بھی تو ایسا ہی خیالی، تجریدی اور موہوم جیسے کسی تصویر کے پیکر کی آنکھ کا تارِ نظر جو ''ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے'' یہ ایک ایسے عہد اور ایک ایسے معاشرے کی تصویر ہے جس میں کوئی ارتقائی عمل، کوئی پیش روی (Progression) ممکن ہی نہیں، اس لئے کہ اظہار و عمل کا کوئی راستہ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ ایسے ہی کسی دشتِ خیال میں دوڑ دوڑ کر جب غالب

تھکتے ہیں تو انہیں اپنی تھکن باندازہ یک بیاباں محسوس ہوتی ہے، اس تجربے میں وہ محسوس کرتے ہیں کہ سفر سے بیاباں کی مسافت تو قطع نہیں ہوتی جبکہ تھکن بہ مقدارِ بیاباں طاری ہو گیا ہے، اس کے باوجود وہ خواہش سفر سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں، جو دراصل زندگی کے تخلیقی عمل کے ساتھ ان کی حقیقت وابستگی (Commitment) ہے۔

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

ایسی ہی صورتِ حال میں صبح کا شام کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ گو تخیل تلافی کی ایسی صورتیں بھی پیدا کرتا ہے جس میں ایک ہی قدم اٹھانے سے دفترِ امکاں کا درس کھل جاتا ہے اور جادہ (راستہ) دشتِ کونین کے اجزاء کا شیرازہ نظر آنے لگتا ہے لیکن اس جادے پر بھی سفر صرف علاماتی طور پر ہی ہوسکتا ہے۔

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا!

اپنی ایک فارسی غزل میں غالب نے اپنے تصور عیش کی تشکیل کی ہے، جو اپنی تفصیلات میں فی الحقیقت ایک فردوسِ خیال ہے تاہم اس کا مطلع علاماتی معنویت کا حامل ہے، گو پوری غزل آرزوئے نشاط کے حوالے سے اپنے عہد کی ترجمان بھی ہے، بہر حال، مطلع ہے:

بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم
قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم

پہلا مصرع ایک انقلابی تغیر کی خواہش کا اعلان کرتا ہے، غزل کے مطالب بتاتے ہیں کہ مخاطب محبوب ہے، تاہم یہ دعوت کہ ''آؤ، کہ آسمان کی بنیادیں (زمانے کے اصولِ گردش) تبدیل کر ڈالیں، ایک عمومی دعوت ہے جس کا مخاطب مرزا غالب کے عہد کا پورا معاشرہ بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن دوسرے مصرع نے اس بلند آہنگی کے طلسم کو یک لخت توڑ دیا ہے، مصرع اولیٰ کی دعوت کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ قضا کو شراب کے بھاری پیالے کی گردش سے تبدیل کر دیں، گویا یہاں بھی عہد کا جبر موجود ہے کہ تبدیلی کا نقشہ صرف اپنے اندر ہی جمایا جاسکتا ہے، ظاہر ہے کہ شراب کے پیالے کی گردش سے صرف اتنی ہی تبدیلی پیدا کی جاسکتی ہے کہ تقدیر بدل جانے کا ایک اندرونی احساس پیدا کر لیا جائے، اگر چشمہ شیریں (منابع حیات) باہر نہیں ہے تو اس کو گدازِ دل سے اپنے اندر ہی پیدا کر لیا جائے، ایک فارسی شعر صریحاً اسی رویے کا ترجمان ہے:

خدایا، زندگی تلخ است، گر خود نقل و مے نبود
دلے دہ کز گدازِ خویش، گردد چشمۂ نوشم

جب معاشرے کا داخلی جمود ظواہر (Appearances) کی کہنگی اور فرسودگی کی صورت اختیار کر لے تو اسی کو انحطاط (Decadence) کہتے ہیں۔ وہ عناصر جو انحطاط کی نمائندگی کا فریضہ سرانجام دے رہے ہوتے ہیں، وضعوں اور صورتوں (Forms) کو برقرار رکھنے کی سعی میں مصروف ہوتے ہیں، ''وضعداری'' کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ انحطاط پذیر معاشرہ اپنے آپ کو برقرار رکھنے کی ایک سعی یوں بھی کرتا ہے کہ موجود صورتوں، وضعوں اور رسموں کو ٹھہرا لینا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ وضعیں اور ظاہری آداب (Forms and Manners) ہی اس کی آخری متاع ہوتے ہیں۔ غالب اپنی ذاتی زندگی میں کتنے ہی وضعدار کیوں نہ رہے ہوں آخر وجودی طور پر وہ اپنے معاشرے ہی کا ایک حصہ تھے۔ اپنی شاعری میں وہ تغیر پسند انسان ہیں، ____ اور ''کہنگی تماشا'' کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے ____ اُن کی ایک فارسی غزل اس خواہشِ تغیر کی ایک خوبصورت روداد بیان کرتی ہے۔ اس غزل کے چند اشعار انقلابی تبدیلیوں کی خواہش کا رنگین مرقع پیش کرتے ہیں:

رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم
در بزمِ رنگ و بو نمطے دیگر افگنم
در وجدِ اہلِ صومعہ ذوقِ نظارہ نیست
ناہید را بہ زمزمہ از منظر افگنم
معشوقہ را ز نالہ بد انسان کنم حزیں
کز لاغری ز ساعدِ او زیور افگنم
ہنگامہ را جحیم جنون بر جگر زنم
اندیشہ را ہوائے فسوں در سر افگنم
نخلم کہ ہم بجای رطب طوطی آورم
ابرم کہ ہم بروی زمیں گوہر افگنم

''میں اس خیال سے چلا کہ رنگ تماشہ سے اس کا پرانا پن اتار پھینکوں، اور رنگ و بو کی محفل میں ایک کلیتہً نئی روش کا آغاز کروں۔ اہلِ خانقاہ کا وجد ذوق نظارہ کی تسکین نہیں کرتا۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسا نغمہ گاؤں کہ خود زہرہ کو اس کی بلندی سے اتار پھینکوں۔ معشوقہ کو اپنے نالوں سے ایسا غمگین کر دوں کہ غم اس کو ناتواں کر دے، اور ناتوانائی کے باعث اس کی کلائی کا زیور گر پڑے۔ (جی چاہتا ہے کہ) ہنگامے کے جگر پر وحشت کا ایک دوزخ دے ماروں اور فکر و خیال کے سر میں جادوگری کی ہوس بھر دوں۔ (دراصل) میں وہ نخل ہوں جو بجائے پھل دینے کے طوطی (آواز، نغمہ) اگاتا ہے، اور میں وہ بادل ہوں جو زمین پر موتیوں کی بارش کر دیتا ہے!''

انقلابی تبدیلیوں کی اس خواہش کی تہہ میں ان کے ناممکن الحصول ہونے کا خفیف سا شائبہ ضرور موجود ہے، اب جبکہ غالب کے کلام کی زمانی ترتیب بہت حد تک متعین ہو چکی ہے، ہمارے لئے ان کی ذہنی، فنی اور فکری ارتقا کا مطالعہ کچھ ایسا مشکل نہیں رہا۔

ان کا وہ دورِ شاعری جس کے ثمرات نسخۂ حمیدیہ میں نظر آتے ہیں، ایک ایسی تخلیقی فعلیت کا زمانہ ہے جس میں وہ تخلیقی سطح پر تاریخی جبریت کے خلاف نبرد آزما دکھائی دیتے ہیں۔ اس زمانے میں سکوت و جمود کو جس طرح حرکت اور تغیر کا اعتبار بخشا گیا ہے، اس کی کچھ مثالیں سطور بالا میں پیش کی گئی ہیں۔ تاہم اس دور کا ایک شعر ایسا ہے جو ان کی روشِ فکر کی علامت ہے:

کون آیا جو چمن بیتاب استقبال ہے
جنبشِ موجِ صبا ہے شوخیِ رفتارِ باغ

اس شعر کے تجزیے سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ (کسی کے استقبال کے لئے) پورے باغ کو متحرک اور خراماں دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ بادِ صبا کی وزش سے متحرک شاخوں اور برگ و بار کے ذریعے باغ کے بیتاب استقبال ہونے کا محض ایک ''اعتبار'' یا بالفاظِ دیگر فریبِ نظر (Illusion) پیدا کر لیں۔

اس دور شاعری میں رفتار سے وابستہ ایسے اشعار اچھی خاصی تعداد میں ہیں جن سے ''رفتار'' کے بے حد انوکھے تصورات کے ساتھ ساتھ حقیقی رفتار کے ناممکن یا لاحاصل ہونے کا خیال بھی برآمد ہوتا ہے۔ کہیں وہ رمیدن (بھاگنا) کو ''واماندگی'' کے باغ کا پھول قرار دیتے ہیں (یعنی بھاگنا ناممکن ہے) کہیں تارِ نفس کو جادہ (راستہ) سے تشبیہ دیتے ہیں۔ کہیں ترکِ جستجو کو ضعف کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور ''ہجومِ تمنا'' سے لاچار نظر آتے ہیں۔ ــــــ چند شعر ملاحظہ ہوں:

رمیدن، گلِ باغِ واماندگی ہے
عبث محمل آرائے رفتار ہیں ہم
اسد، شکوہ کفر و دعا ناسپاسی
ہجومِ تمنا سے لاچار ہیں ہم

جس دم کہ جادہ ہو تارِ نفس تمام
پیمائشِ زمینِ رہِ عمر بس تمام

خوش اوفتادگی! کہ بہ صحرائے انتظار
جوں جادہ گردِ رہ سے نگہ سُرمہ سا کروں

ضعف سے ہے، نَے قناعت سے یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم!

راہِ عمل کی تلاش کا جذبہ بعض اوقات کچھ انوکھی صورتیں بھی اختیار کرتا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً انہیں ''صفحۂ دشت'' (دشت کو ایک صحہ قرار دینا بھی قابلِ توجہ ہے) اپنی یا اپنے جیسے کسی اور رہرو کی رفتار کی حدت سے ''جلا ہوا کاغذ'' (کاغذِ آتش زدہ) دکھائی دیتا ہے۔ یا مثلاً کہیں وہ خود کو نصیحت کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ راہ شوق اگر کسی اور طرف وا نہیں ہوتی تو اسے قمری کے بال و پر کی خلوت کی طرف وا کر، اس انوکھی روش کو اختیار کرنے کا سبب وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ باغ کا راستہ (جادۂ گلشن) درختوں کے ریشوں کی طرح زمین کے نیچے کی طرف جا رہا ہے۔

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیِ رفتار ہنوز

خلوتِ بال و پرِ قمری میں وا کر راہِ شوق
جادۂ گلشن برنگِ ریشہ زیرِ خاک ہے

لیکن اہم ترین بات یہ ہے کہ اس دور کی شاعری میں رفتار، پرواز، موج، دریا اور شوق، شعلہ، چراغ اور پرواز جیسے استعاروں میں جہاں راہِ عمل کے مسدود ہونے یا تنگ ہونے کا احساس فراوانی سے ملتا ہے، وہاں ان استعاروں اور ان سے ابھرنے والے تلازمات کی بدولت نادر اور نازک ادراکات (Perceptions) کا ایک رنگین، خیال افروز اور شعور آفریں ذخیرہ بھی فراہم ہو گیا ہے۔ جس کی مثال ہماری شعری روایات میں شاید ہی یکجا مل سکے۔ مزید یہ کہ انہیں ادراکات کی توسیع رفتہ رفتہ فکر کے ایک ارتقائی سلسلے کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے۔ جس میں بعض حیات بخش خیالات ایک مرتب صورت میں بھی مل جاتے ہیں ان حیات بخش خیالات میں ان کے نظریۂ ''نعم البدل'' کے علاوہ ان کی دانش افروز تشکیک بھی شامل ہے جسے ان کے ''فلسفۂ حقیقت اشیاء'' کا نام حیاتِ انسانی کی ایک بے حد بامعنی کہانی مرتب کی جا سکتی ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے ادبی تناظرات میں غالب کی شخصیت اور شاعری تخلیقی معنویت کے ایک روشن استعارے کی طرح چمکتی دمکتی دکھائی دیتی ہے۔ گزشتہ ایک صدی مین ان کی انوکھی شخصیت، ان کے فکر و خیال اور اسالیب بیان نے جس طرح اردو شعر و ادب کو متاثر کیا ہے اور تخلیقی ذہنوں کو تخلیقیت کے پیرائے عطا کئے ہیں، اس کے اعتبار سے اگر انہیں اردو شاعری میں تخلیقی معنویت کا روشن ترین استعارہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

❀❀❀

CamScanner

سندھی ادب کا اجمالی جائزہ

مرزا کاظم رضا بیگ

سندھی زبان، پاکستان کی ایک قدیم ترین زبان ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق سندھی میں شاعری کی ابتدا گیارہویں صدی عیسوی میں ہو چکی تھی۔ اس دور میں رزمیہ داستانوں اور عوامی گیتوں نے جنم لیا۔ بعد میں سورٹھے، دوہے، وائیان اور کافیاں لکھی گئیں۔ پھر فارسی شاعری کے زیر اثر فارسی اصناف سخن غزل، مرثیہ وغیرہ لکھی گئیں۔ انگریزی عہد میں نثری ادب کی تخلیق ہوئی۔ غرضیکہ قیام پاکستان سے پہلے سندھی ادب نے کافی ترقی کر لی تھی اور سندھی میں شاعری کی اصناف کے علاوہ نثری ادب میں افسانے، ناول اور ڈرامے پر بھی طبع آزمائی کی گئی تھی۔

سندھی ادب میں شاعری کا حصہ نسبتاً زیادہ ہی رہا ہے۔ شاعری اور موسیقی اس علاقے کے باشندوں کے رگ و ریشہ میں رچی بسی ہے۔ سندھی کلاسیکی شاعری میں تقریباً ہر نفیس ترین احساس کو الفاظ کے روپ میں ڈھالا گیا ہے۔ مناظر فطرت اور انسانی احساسات کے بارے میں بڑی خوبصورت شاعری کی گئی ہے۔

عوامی داستانوں، اسلامی تعلیمات، تصوف کے باریک نکات اور انسانی برادری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ شاہ عبدالکریم، میوں شاہ عنایت لطف اللہ قادری، شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست، خلیفہ نبی بخش، فقیر قادر بخش بیدل وغیرہ نے کلاسیکی سندھی شاعری میں کمال حاصل کیا۔ ان شاعروں نے خیال و فکر کے ساتھ ساتھ ہیئت میں بھی نئے تجربے کیے اور سندھی شاعری کے دامن کو وسعت بخشی۔ فارسی شاعری کے زیر اثر سندھی شاعروں نے غزل میں مقامی ماحول اور فضا کو بیان کیا۔ گل، گدا، سانگی، فاضل اور دوسرے شعراء کی غزلوں میں مقامی ماحول اور فضا نمایاں ہے۔

انگریزی عہد حکومت میں مغربی ادبیات کے زیر اثر سندھی ادب میں نثر کی ابتدا ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ شاعری میں بھی نئے موضوعات نے جنم لیا۔ مرزا قلیچ بیگ اور محمد صدیق مسافر نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھیں اور ترجمہ کیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد سندھی شاعری میں ایک نیا موڑ آیا۔ کشچند بیوس نے ''الاجھرے م شال غریبن جی جھونپڑی'' نظم لکھ کر سندھی شاعری میں پہلی مرتبہ سماجی مسائل کی طرف اشارہ کیا۔ چنانچہ اس دور کے کئی دوسرے شعراء نے ان مسائل پر طبع آزمائی کی اور اس طرح کئی سماجی اور سیاسی موضوعات پر نظمیں لکھی گئیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران تحریک آزادی کے زیر اثر سندھی شعراء نے سیاسی مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ اس دور میں شیخ ایاز اور ان کے ساتھی شعراء نے بہت سی نظمیں لکھیں جن کی وجہ سے سیاسی شعور کو جلا ملی اور آزادی کی تڑپ میں اضافہ ہوا۔ موجودہ دور میں سندھی شاعری میں ہیئت کے کئی تجربے کیے گئے ہیں۔

شیخ ایاز اور ان کے ہم عصر نوجوان شعراء نے سندھی کلاسیکی شاعری کی مختلف اصناف میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انہوں نے وائیان لکھیں، بیت لکھے اور غزل کو بھی اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ ان اصناف کے علاوہ انہوں نے مغربی شعریات کے زیر اثر آزاد نظم، ترائیل اور ہائیکو جیسی اصناف سخن کو سندھی شاعری میں متعارف کرایا۔ سندھی کے جدید شعراء نے ہیئت اور اسلوب میں تجربے کیے۔ علاوہ شاعری میں الفاظ کی اہمیت کو سمجھا اور اپنے خیالات ایسے الفاظ میں ادا کیے جو عام بول چال کی زبان سے ادا گئے ہیں۔ ٹالپر عہد اور انگریزوں کے عہد میں بعض سندھی شعراء نے اپنی غزلوں میں بدیسی الفاظ و تراکیب کا بھرپور استعمال کیا ہے، جس کی وجہ سے ان کے اشعار میں مصنوعی زبان نے جگہ لے لی لیکن جدید شعراء نے ان الفاظ و تراکیب سے گریز کرتے ہوئے وہ الفاظ و تراکیب استعمال کیں جو سندھی کلاسیکی شاعری میں مروج تھیں۔ شیخ ایاز، نیا ہمایونی، پردو سندھی، تنویر عباسی، شمشیر الحیدری اور امداد حسینی وغیرہ نے عوامی زبان اور عوامی داستانوں کے کرداروں اور ماحول کو دوبارہ شاعری میں متعارف کر کے سندھی کلاسیکی شاعری سے اپنا رشتہ قائم رکھا۔ ان شعراء نے خصوصاً اس دور کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ انہوں نے داخلی معاملات کے بجائے خارجی معاملات پر زیادہ توجہ دی اور تیسری دنیا کے سیاسی مسائل جنگ عالمی اقتصادی، بدحالی، سائنس کے کمالات اور عالمگیری برادری جیسے موضوعات پر بھی اظہار خیال کیا۔

جدید سندھی ادب میں نثر نے بھی بڑی ترقی کی ہے۔ اس ضمن میں مرزا قلیچ بیگ، مرزا نادر بیگ، میرزا قر[illegible] بیگ کربلائی ثم المشہدی اور ان کے صاحبزادے میرزا علی محمد بیگ مظفر، دیوان کوڑمل، بھائی پرمانند میوارام، بھیرومل مہرچند آڈوانی، جھیٹمل پرسرام، لعل چند امرڈنہ مل، ڈاکٹر گربخشانی، مولوی فتح محمد سہیوہانی، خان بہادر محمد صدیق میمن، محمد بخش واصف، محمد صدیق مسافر، مولوی دین محمد وفائی، لطف اللہ بدوی، علی خان ابڑو، ڈاکٹر عمر بن داؤد پوتہ وغیرہ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد سندھی ادیبوں نے اس طرف خاص توجہ دی ہے۔ چنانچہ مذہبیات، تاریخ، لسانیات، ادبی تاریخ، سیاسیات وغیرہ کے موضوعات پر کئی کتابیں لکھیں اور مرتب کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ سندھی زبان کے پہلے محقق ہیں، جنہوں نے حضرت شاہ لطیف بھٹائی کے معاصر شعرا میوں شاہ عنایت اور لطف اللہ قادری کے رسالوں کو مرتب کیا اور تعارف، تعلیقات و تشریحات کے ساتھ شائع کر کے سندھی شاعری کی گمشدہ کڑیوں کی نشاندہی کی۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے سندھ کے شمال مغربی علاقے کوہستان کے عوامی شعراء سے متعلق ایک محققانہ کتاب ''بیلائن جابول'' لکھ کر سندھی عوامی شاعری کی اہمیت پر توجہ مبذول کرائی۔ آپ نے سندھی لوک ادب کے سلسلے

CS CamScanner

کی اب تک تقریباً ایک جلدیں مرتب کی ہیں، جن میں مدح ومناجات، مناقبا، معجزات، مولود، سہ حرفیاں، جنگ نامے، واقعاتی بیت، پہیلیاں، لوک گیت، بیت، کافیاں، مشہور سندھی قصے، لوک کہانیاں وغیرہ مشہور ہیں۔ شاعری کے علاوہ ڈاکٹر بلوچ مرحوم نے سندھ کی کئی فارسی تاریخیں مرتب کی ہیں اور سندھی لسانیات کے بارے میں سندھی زبان کی تاریخ لکھ کر سندھی زبان کی قدامت اور ثقافتی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ علاوہ بلوچ صاحب مرحوم نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے رسالوں کو از سرنو مرتب کیا ہے اور اس وقت آپ کے شاگرد رشید ڈاکٹر عبدالغفار سومرو اس پر مزید کام کررہے ہیں۔ دوسری طرف پیر حسام الدین شاہ راشدی نے سندھ کی تاریخ پر از سرنو تحقیق کی ہے۔ پیر حسام الدین شاہ راشدی نے اپنے بھائی پیر علی محمد شاہ راشد کی طرح تاریخ سندھ کی گمشدہ کڑیوں کی بازیابی کے لیے سخت محنت ومشقت کی۔ انہوں نے ٹھٹھہ کے مشہور مورخ میر علی شیر قانع کی کتابیں تحفۃ الکرام، مقالات الشعراء، مکلی نامہ اور مخدوم ابراہیم خلیل ٹھٹھوی کی تکلمہ مقالات الشعرا کی تصحیح وتدوین کی۔ ان کی یادداشت پر سندھی زبان میں کتاب ''ھوڈوتھی موڈ ٹھن'' سندھی ادبی بورڈ نے شایع کی تھی۔ جس میں تاریخ سندھ کے گزشتہ ایک سو برس کی معاشرتی تاریخ کے اہم واقعات درج ہیں اور اس طرح انہوں نے تاریخ سندھ کے اہم دور کے سماجی، ثقافتی اور ادبی روایات کو محفوظ کردیا ہے۔

ان تحقیقوں کے علاوہ ڈاکٹر ممتاز حسین پٹھان، ڈاکٹر میمن عبدالحمید سندھی، مولائی شیدائی، میرزا عباس علی بیگ، ڈاکٹر قریشی حامد علی خانائی وغیرہ نے تاریخ سندھ پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی اور مولانا غلام محمد گرامی وغیرہ نے علمائے سندھ کی عربی تصنیفات اور سندھی مذہبی شاعری سے متعلق کئی مضامین لکھے ہیں اور ان علماء کی تصانیف کو مرتب کیا ہے۔

سندھ کے ان صوفیوں اور عالموں کا سب سے بڑا ذریعہ اظہار سندھی زبان رہی ہے۔ اس کا ثبوت قدیم قلمی نسخے اور وادیٔ سندھ سے متعلق لکھی گئی تاریخیں فراہم کرتی ہیں۔ قرآن شریف کا پہلا سندھی زبان میں ترجمہ ہوا اور یہ حقیقت پاکستان کے لیے باعث فخر ہے۔ سندھی زبان میں علم وادب کی سب سے بڑی لہر پندرہویں، سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں آئی۔ اس دور میں ایک طرف سندھ کے مشہور علماء مخدوم ابوالحسن، مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی اور دیگر عالموں نے مکتبوں میں بیٹھ کر علم کے چراغ روشن کیے اور سندھی زبان میں تعلیم دی۔

اسلام سے قربت کے باعث سندھی زبان کو عربی طرز تحریر میں لکھنے کا جو رواج ہوا، اس کی نشانیاں چودھویں صدی عیسوی میں لکھے ہوئے قلمی نسخوں میں موجود ہیں۔ اس طرز تحریر کو انگریزوں نے بھی برقرار رکھا اور یہ بھی قائم ہے۔ سندھی زبان پہلے بھی ذریعہ تعلیم رہی ہے اور آج بھی ہے۔

سندھ کے ایک مردم خیز خطے لاڑکانہ کو بھی یہ شرف حاصل ہے۔ یہاں قدیم دور سے سکونت پذیر قادری خاندان کے اہل قلم نے ایسے جوہر دکھائے کہ اس خانوادے کا نام سندھی ادب میں سرفہرست رہے گا۔ انہوں نے اپنی نگارشات شایع کروا کے سندھی ادب میں بہت بڑا اضافہ کیا، جن میں میاں علی محمد فقیر قادری، میاں علی عباس جوش وغیرہ بعدازاں ڈاکٹر ایاز حسین قادری اور الطاف حسین قادری نے بھی سندھی ادب کو اپنی بیش بہا علم پروری سے بھرپور نوازا۔

سندھی زبان میں لوک ادب کے تین بڑے دور رہے ہیں۔ ایک دور صوفیوں کا ہے جس میں زمین اور روایات کی خوشبو ہے۔ اسلام کی اصل روح ہے اور لوک زندگی کی معلومات ہے۔ دوسرا دور بادشاہوں، نوابوں، سرداروں اور بااثر لوگوں کی محفلوں کا ہے۔ جہاں روایتی قسم کے سگھڑ جمع ہوتے تھے اور اشعار اور نظموں میں قصے کہانیاں اور عقل ودانش کی دوسری باتیں بیان کرتے تھے۔ تیسرا دور عام لوگوں کی تخلیقی قوت ہے۔ ان کا انداز بیان ہے اور رویے ہیں۔ ان تینوں ادوار نے مل کر ایک خوبصورت دنیا تخلیق کی ہے۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے کچھ سال بعد جو تخلیقی ادب سندھی زبان میں اُبھرا اس میں مغربی ادب کے جدید لوازمات کے ساتھ اوپر بیان کیے گئے تینوں دور شامل ہو گئے اور سندھی ادب کو صحیح معنوں میں زمین کی خوشبو اور عصری روح عطا ہوئی۔ یہ ساری صورت حال سندھ کی ثقافت، سماجی حالات اور تاریخ پر ہونے والی تحقیق کے کام کی ہے۔ نہ صرف سندھی زبان میں بے حد تحقیقی کام کیا گیا ہے بلکہ سندھ کی ثقافت اور تاریخ کے متعلق انگریزی زبان میں بھی کافی کام ہوا ہے۔ سندھی زبان میں جن لوگوں نے اتنا سارا تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی ادب پیدا کیا ہے اور جنہوں نے اس قدر محنت کی ہے ان کو میں داد دیے بغیر اور سندھی زبان کی قوت کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

افسانوی ادب میں بھی نت نئے تجربات کیے گئے ہیں۔ جدید سندھی افسانے کی ابتدا مرزا قلیچ بیگ اور ان کے بیٹے مرزا نادر بیگ کے افسانوں سے ہوئی۔ انہوں نے معاشرتی موضوعات پر افسانے لکھے۔ شیخ ایاز اور دوسرے افسانہ نگاروں نے دوسری جنگ عظیم اور تحریک آزادی کے زیر اثر کئی افسانے لکھے جن میں جنگ کی تباہ کاریوں اور غلامی کی لعنت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی وجہ سے سندھی ادیبوں نے ڈراموں کی طرف بھی توجہ دی ہے اور سید منظور تقوی، آغا سلیم، علی بابا، عبدالقادر جونیجو، شوکت حسین شورو، امر جلیل اور عبدالکریم بلوچ، ڈاکٹر قاضی خادم سندھی میں کئی ڈرامے لکھے۔ آغا سلیم نے سندھ کی لوک داستانوں پر مبنی کئی ڈرامے لکھے جو اسٹیج کیے گئے اور ریڈیو اور ٹی وی سے نشر ہوئے۔

یہاں ایک بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جو مقام سندھی ادب میں ڈاکٹر کلیم اللہ لاشاری نے اپنی محنت سے حاصل کیا ہے وہ قابل مستحسن ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے ''انیس سو تیراسی'' کو جو پذیرائی ملی ہے وہ شاید ہی کسی کے حصے میں آئی ہو۔

اس وقت سندھ میں سندھی ادیبوں کا ایک جم غفیر موجود ہے جن کی نظم ونثر میں اپنی تخلیقات سندھی ادب میں یقیناً اضافہ ہوگا۔

خوبصورت مساجد از فقیر اللہ خاں

لبنیٰ صفدر/ لاہور

حدیث مبارکہ ہے کہ ''قیامت کے دن ساری زمین ختم کردی جائے گی مگر مساجد باقی رہیں گی۔ تمام مساجد ایک دوسرے کے ساتھ ضم کر کے یکجا کر دی جائیں گی۔''

مساجد مذہب کے حوالے سے ایک ایسی زنجیر ہے جس میں مسلمان ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر اپنے یکجا ہونے اور مذہب سے محبت کا ثبوت دیتے ہیں۔ جس طرح جسم اور روح کا آپس میں گہرا رشتہ ہے بالکل اسی طرح مساجد مذہبی ہم آہنگی اور بھائی چارے کے علاوہ زمین پہ عمارتی حُسن میں اضافہ بھی کرتی ہیں۔ مساجد صرف عبادت گاہ ہی نہیں بلکہ یہ دینی اخلاقی، معاشرتی، فلاحی، رفاہی قیادت کی آماج گاہ بھی ہیں۔ اس لیے ان کی اہمیت و عقیدت میں دوچند اضافہ ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں نے اسلام سے محبت وعقیدت کے اسی اظہار کے طور پر دنیا بھر میں مساجد کی ایسی ایسی شاہکار عمارتیں بنا ڈالی ہیں جن کو دیکھ کر نہ صرف مسلمان بلکہ دیگر مذاہب کے لوگ بھی متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔

حال ہی میں فقیر اللہ خاں کی کتاب ''خوبصورت مساجد'' موصول ہوئی۔ مساجد بنانے والوں نے جس طرح اپنی محبت اور عقیدت کا تعمیرات کی صورت میں اعتراف کیا بالکل اسی طرح اس جذبے کو فقیر اللہ خاں نے اسی تمام حسین وجمیل مساجد کو اپنی کتاب میں تحریری صورت میں یکجا کر کے عشق حقیقی کے جذبے کا حق ادا کر دیا۔

سورہ جن میں اللہ پاک نے ارشاد فرمایا کہ ''مسجدوں کی تعمیر وہی کرتے ہیں جن کا ایمان اللہ پر اور قیامت کے دن پر ہے۔''

مجھے لگتا ہے ''خوبصورت مساجد'' جیسی کتاب ترتیب دے کر فقیر اللہ خاں نے بھی سچے مسلمان ہونے کا ثبوت دیا ہے کہ وہ اللہ اور قیامت کے پر یقین رکھتے ہیں۔

''خوبصورت مساجد'' کا جہاں موضوع انتہائی اعلیٰ اور خوبصورت ہے وہیں کتاب کی اشاعت بھی انتہائی دیدہ زیب، دلکش اور دل کو چھو لینے والی ہے۔ اعلیٰ ترین معیاری پیپر پر چھپی اس کتاب میں ہر مسجد کی رنگین تصویر دی گئی ہے جس سے قاری نہ صرف اس مسجد کے متعلق معلومات سے محظوظ ہوتا ہے بلکہ مسجد کے دیدار سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک بھی پہنچاتا ہے۔ یہ مسجد کی تعمیر کی خوبیوں سے بھی آشنا ہوتا ہے اور ہر مسجد کے تعارف کی تحریر اُس کے ایمان کو اور بھی ترو تازہ کر دیتی ہے۔ یہ کتاب مشہور اشاعتی ادارے ''دارالسلام'' سے شائع ہونے کا شرف رکھتی ہے۔ اگر میرا حساب درست ہے تو اس کتاب میں 115 خوبصورت مساجد کا ذکر کیا گیا ہے۔ ابواب بندی بھی بڑے عمدہ طریقے سے کی گئی ہے۔ ہر ملک سے بلکہ آپ کہہ سکتے ہیں دنیا کے تمام اہم ممالک سے مساجد کا انتخاب کر کے درجہ بندی کی گئی ہے۔ ان ممالک میں سعودی عرب، پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، ملائیشیا، انڈونیشیا، مراکش، فلسطین، ترکی، برونائی، ابوظہبی، دبئی، عمان، قازقستان، سری لنکا، روس، بحرین جیسے بے شمار مسلم ممالک کے ساتھ یورپین ممالک اور شہر بھی شامل ہیں۔ جیسے نیویارک، فرانس، آسٹریلیا اور اٹلی وغیرہ۔

کتاب کے پہلے صفحہ پر قرآنی آیت معہ ترجمہ درج ہے:

''اور مسجدیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ لہٰذا اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔'' (سورہ جن: 18)

اگلے صفحہ پر کچھ احادیث کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔ انتساب بھی خوب صورت ہے۔

''اپنے پیارے والدین کے نام جنہوں نے میرے بچپن میں برسات میں بھی مجھے مسجد جانے کی ترغیب دی۔''

صاحب کتاب پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ ''دنیا کی یہ خوبصورت مساجد کئی برسوں اور کئی مراحل میں تکمیل کو پہنچیں۔ واقعی اللہ کے گھر کی تعمیر کوئی آسان کام نہیں۔ راقم کو تو ان مساجد کے تعارف کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنا بھی ایک مشکل مرحلہ محسوس ہوا۔ اللہ کا نام لے کر دنیا کی سینکڑوں مساجد میں سے خوبصورت مساجد کا انتخاب مشکل مرحلہ ضرور تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔''

یہ بات بھی مصنف کی عاجزی و انکساری کا ثبوت ہے۔ کیونکہ واقعی یہ ایک کٹھن اور نازک مرحلہ تھا۔ ناممکن نہیں تھا کہنا بے پناہ محبت کے اظہار کو ظاہر کرتا ہے۔ اس حوصلے اور عزم کو ظاہر کرتا ہے جو کسی بھی انسان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ اسی راز کو پا لینے والے اپنی منازل کو بھی پا لیتے ہیں۔ یقیناً فقیر اللہ خاں اپنے جذبے کی صداقت دینی محنت اور اللہ سے، اللہ کی مساجد سے اپنی محبت کا منہ بولتا ثبوت اس کتاب کو قاری کے حوالے کر کے کر رہے ہیں۔ ایسے شخص کا احسان مند بھی ہونا چاہیے جو ایسا تخلیقی کام مکمل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ جس سے ہر مسلمان کا دل مسرور ہوتا ہے۔

قارئین! آپ کو اس کتاب کی ایک اور خوبصورتی بھی بتا دوں، جس ملک کی مسجد یا مساجد کا ذکر ہو اُس سے پہلے مصنف نے اُس ملک کی جغرافیائی حیثیت کا مختصر تعارف بھی شامل کیا ہے۔

صاحب ذوق لوگوں کے لیے کتاب اس سیکشن کی وجہ سے مزید پرکشش ہو گئی ہے۔ اندازِ بیان نہایت سادہ، ستھرا اور معلومات سے بھرپور ہے۔ آپ اسے خوبصورت مساجد کا انسائیکلوپیڈیا بھی کہہ سکتے ہیں۔ حوالہ کے لیے آپ کو پہلی مسجد کی تحریر میں سے ایک ٹکڑا پیش کروں گی جس سے مندرجہ بالا تعریف کی وضاحت ہو جائے گی۔

''مسجد حرام'' یہ مسجد مسلمانوں کے مقدس ترین شہر مکہ میں واقع ہے۔ اسی شہر میں مسلمانوں کا مرکز خانہ کعبہ (بیت اللہ) موجود ہے۔ اس وقت مسجد حرام کا رقبہ 356800 مربع میٹر (88.2 ایکڑ) ہے، اور یہاں بیک وقت 820,000 نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔ جبکہ ایامِ حج میں اس کے اطراف میں 40 لاکھ

نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔ مسجد کے بلند و بالا 9 مینار ہیں اور ہر مینار کی بلندی 292 فٹ ہے۔ بیت اللہ کے ایک کونے میں وہ سیاہ رنگ کا پتھر ہے جسے حجرِ اسود کہتے ہیں۔

ہو سکتا ہے مسجد حرام کے بارے میں یہ سب معلومات ہم میں سے اکثر کو معلوم ہوں، لیکن میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ بہت ساری مساجد کے بارے میں ہمیں معلومات نہیں ہیں۔ اس کتاب کا فائدہ یہ ہوا کہ صاحبانِ علم کو ایک ہی جگہ پر کافی اچھا اور معلوماتی مواد دستیاب ہو گیا جہاں ممالک کو جغرافیائی معلومات کے ساتھ ساتھ نقشہ جات سے واضح کیا گیا ہے وہیں پر مسجد کی عکس بندی مختلف زاویوں سے دی گئی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس ملک میں جائے بغیر خدا کے اس حسین گھر کی زیارت آپ گھر بیٹھے مفت میں کر رہے ہیں۔ قاری اپنے آپ کو اُسی جگہ پر موجود محسوس کرتا ہے۔ بعض اوقات تو ایسی چونکا دینے والی معلومات نظروں سے گزرتی ہیں کہ اپنی کم علمی پر تھوڑا افسوس بھی ہوتا ہے، لیکن خوش آئند یہ ہے کہ اب کتاب کی صورت میں اس کم علمی کو ختم کرنے کا موقع مل گیا ہے۔

کولون مسجد، ہانگ کانگ (چین) کے بارے میں لکھتے ہوئے آغاز کرتے ہیں کہ یہ بات قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگی کہ اس وقت چین میں تقریباً 35,000 مساجد ہیں۔ صرف ہانگ کانگ شہر میں 20 سے زیادہ مساجد ہیں۔ کولون مسجد ہانگ کانگ کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ شہر کی تمام مساجد کی ایک مشترکہ کمیٹی بنی ہوئی ہے جس کا مرکزی دفتر اسی اسلامی مرکز میں ہے۔

مولانا روم مسجد جو روٹرڈیم (نیدرلینڈ) میں واقع ہے یہ مسجد روٹرڈیم میں مقیم ترک مسلمانوں نے 2001ء میں تعمیر کروائی۔ یہ ترک دوسری جنگ عظیم (1939-45) کی تباہی کے بعد تعمیراتی کاموں کے سلسلے میں یہاں آباد ہوئے تھے۔

ترکی کا فنِ تعمیر اپنی مثال آپ ہے۔ دنیا کی خوبصورت ترین مساجد میں سے کئی ایک ترکی میں موجود ہیں۔ یہاں ترکی کی 4 نمایاں خوبصورت مساجد کا ذکر موجود ہے جسے سبانسی مرکزی مسجد (ادانا) سلطان احمد مسجد (استنبول) نئی مسجد (استنبول) اور سلیمانیہ مسجد (استنبول) ادانا میں موجود سبانسی مرکزی مسجد کو ترکی کی سب سے بڑی مسجد کہا جاتا ہے۔ اس مسجد کا بیرونی ڈیزائن استنبول کی سلطان احمد مسجد (نیلی مسجد) سے مشابہ ہے۔ 566،200 مربع فٹ پر تعمیر ہونے والی یہ مسجد 1998ء میں نمازیوں کے لیے کھول دی گئی۔

اس کا مسقف حصہ 71044 مربع فٹ ہے۔ اس میں 28500 نمازیوں کی گنجائش موجود ہے۔ مسجد کے اونچے مینار کنکریٹ سے بنائے گئے ہیں۔ ان کا رنگ ہاتھی کے دانتوں جیسا ہے۔ بلند میناروں کے اوپر ایسا ریڈیو سسٹم لگایا گیا ہے جہاں سے اس مسجد کے خطیب کا واعظ مخصوص فریکوئینسی کے ذریعے نشر کیا جاتا ہے۔ جو 60 کلومیٹر کے دائرے کی 300 مساجد میں سنا جا سکتا ہے۔ مسجد کے ساتھ ملحق ایک ڈیجیٹل لائبریری بھی ہے۔ خاص تہواروں پر شہد کا شربت مہمانوں اور نمازیوں کو پیش کیا جاتا ہے۔

فقیر اللہ خاں کی یہ نادر کتاب اس طرح کی بے شمار دلچسپ معلومات سے بھری ہوئی ہے۔ قاری اس کتاب کا مکمل مطالعہ کیے بنا رہ ہی نہیں سکتا۔ پیرایہ اظہار اتنا سادہ آسان دلچسپ اور معلوماتی ہے جو پڑھنے والے کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتا ہے۔ کسی بھی جگہ بوریت یا صاحب کتاب کے کم مطالعہ کا احساس نہیں ہوتا۔

فقیر اللہ خاں نے اس کتاب کے لیے جہاں مواد اکٹھا کرنے کے لیے بے پناہ محنت کی ہے وہیں یہ کوشش بھی کی ہے کہ قاری تک درست اور مکمل معلومات کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔

ترکی میں موجود ایک اور مسجد ''نئی مسجد'' کے نام سے ہے۔ یہ مسجد سلطنت عثمانیہ کی ایک خوبصورت یادگار ہے جو استنبول شہر میں آبنائے باسفورس کے کنارے شاخ زریں پر غلطہ پل کے پاس واقع ہے۔ مصنف کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہ مسجد اور پل دونوں یادگاریں ان کی دیکھی ہوئی ہیں۔ اس مسجد کی تعمیر سلطان مراد سوم (1574-95) کی بیوی صفیہ سلطانہ کے حکم پر 1597ء میں شروع کی گئی اس مسجد کی تعمیر نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک جاری رہی۔ اس دوران میں تعمیر کردہ کچھ حصہ 1660 میں آگ کی نذر ہو گیا۔ تو شاہی ماہر تعمیرات مصطفیٰ آغا نے سلطان محمد چہارم (87-1648) کی والدہ کو مشورہ دیا کہ مسجد کی تعمیر کا کام ترجیحی بنیادوں پر مکمل کروایا جائے۔ آخر کار 1665ء میں یہ مسجد مکمل ہو گئی اور اس کا افتتاح 1666ء میں کر دیا گیا۔

قارئین! چند ایک اقتباسات نمونے کے طور پر مضمون میں تحریر کیے ہیں، جن کے مطالعہ کے بعد مضمون اور صاحب مضمون کی کاوش اور کتاب کی خوبصورتی کے بارے میں جاننے میں تھوڑی سی آسانی ضرور ہو جائے گی۔ ورنہ یہ ضخیم کتاب اپنے 332 صفحات میں دنیا بھر کی خوبصورت مساجد کا ایسا خزانہ چھپائے ہوئے ہے جس کے بارے میں بتانے کے لیے ایک مضمون یقیناً ناکافی ہے۔

ویسے بھی مجھے جس طرح مطالعہ کرنے کے بعد محسوس ہوا اُس کو میں سارا تو نہیں لیکن چند سطروں میں کسی حد تک بیان کر سکی ہوں۔ دیگر احباب یقیناً اس خوبصورت موضوع کی باریک ترتیب کھولتے اور اس کی خوبصورتی و حساسیت کو مجھ سے زیادہ بہتر محسوس کر سکیں گے۔ کتاب کا مطالعہ کے بعد آپ کو ایک گونہ اطمینان اور کچھ فخر بھی محسوس ہوتا ہے کہ آپ کا تعلق یقیناً دنیا کے سب سے بہترین مذہب سے ہے اور اسلام کی روح سے وابستہ یہ عمارتیں محض اینٹوں اور پتھروں کا شاہکار نہیں ہیں بلکہ ان کے گارے میں عشق کا عرق شامل کر کے گوندھا گیا تو یہ تخلیقات دنیا کے سامنے اپنے وجود کے پورے وقار کے ساتھ سینہ تانے کھڑی ہیں۔

ان مساجد کے بلند و بالا حسین مینار اور ان میناروں کے کلس کی شان و شوکت کا مقابلہ دنیا کا مہنگے سے مہنگا ہیرے جڑا تاج بھی نہیں کر سکتا۔

مصنف کو اجر تو اس ذات باری نے دینا ہے جس کی محبت و عقیدت میں اس کتاب کی تکمیل کر کے اس کے باقی چاہنے والوں کے ہاتھوں میں پہنچا دیا گیا۔

ہماری دعا ہے کہ انہیں ایسی مزید کتابیں تخلیق و تشکیل کرنے کی سعادت نصیب ہوتی رہے۔ آمین

CamScanner

احمد ندیم رفیع آج اور کل کا شاعر

حسن عباسی/لاہور

زندگی میں انسان حالات کے مطابق مختلف کیفیات سے گزرتا ہے۔ موسموں کی طرح اُس کا مزاج بھی بدلتا رہتا ہے۔ فن کار بھی گاہے بہ گاہے ایسی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے۔ شاعر پر ایسا وقت بھی آتا ہے کہ جن شعروں پر وہ کبھی سر دُھنتا تھا اُسے وہی اشعار پھیکے اور بے رس لگنے لگتے ہیں۔ یہ وہ فیز ہوتا ہے جس میں میرؔ و غالبؔ کی شاعری سے بھی حظ اُٹھانا محال ہوتا ہے۔

جب احمد ندیم رفیع سے میرا تعارف ہوا میں بھی ایسی صورت حال سے دوچار تھا اور وہ بھی عرصہ دراز سے غمِ روزگار میں اُلجھ کر اپنی شاعری سے بہت دور جا چکا تھا۔ سات سمندر حائل ہونے کے باوجود یہ مشترکہ خلا ہمیں حادثاتی طور پر ایک دوسرے کے قریب لایا۔ اُس نے مجھے یکسانیت کی زد سے اور میں نے اُسے مصروفیت کی حد سے باہر کھینچا اور ہم رفتہ رفتہ اپنی اپنی شاعری کے پاس لوٹ آئے۔ ہم طرحی مصرعوں پر غزلیں لکھنے لگے۔ اس دوران رفیع کی غزلوں نے مجھے چونکایا۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ منفرد اور بھرپور شاعر مناسب شعری ماحول نہ ہونے کے سبب ضائع ہو رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کی شاعری خود اُس کی طرف سے بھی عدم توجہی اور بے اعتنائی کا شکار تھی۔

احمد ندیم رفیع نے جب مجھے اپنی دو دہائیاں قبل کی غزلیات بھیجیں تو وہ اتنی شاندار اور دل پذیر تھیں کہ میں نے انہیں ایک سے زائد بار پڑھا اور اُسے بھرپور داد دی۔ جس کا مثبت نتیجہ نکلا اور اُس نے گزشتہ تیس برس کی فرد فرد شاعری کو نہ صرف از سرِ نو جمع کیا بلکہ نئی غزلیں بھی کہیں اور خوب کہیں۔

میں ہوں کشتہ ترے حُسنِ سخن آرائی کا
خامشی بیچ میں وقفہ ہے مسیحائی کا
نوعِ انساں کے خیالات پہ قدغن کیونکر
جب کنارہ نہیں آفاق کی پہنائی کا
آئنہ نقش گری کرتا ہے اپنی خود بھی
عکس محتاج نہیں چشمِ تماشائی کا
روز آتا ہے مرے کنجِ ساعت میں کوئی
ایک گُل دستہ اُٹھائے ہوئے زیبائی کا

احمد ندیم رفیع کی شاعری کی جڑیں روایت میں بہت گہری ہیں۔ الفاظ، تراکیب، مصرعوں کی بندش اور اشعار کی فضا سے بھرپور روایتی غزل کا تاثر ملتا ہے، لیکن اُس کی انفرادیت یہ ہے کہ اسی فضا میں معانی کی سطح پر جدت اپنی جھلک دکھاتی ہے اور کرافٹ میں نیا پن محسوس ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا غزل کے اشعار اپنے اندر یہی حُسن اور رعنائی لیے ہوئے ہیں۔ ہر شاعر اپنے اندر کی فضا، اردگرد کے ماحول اور زندگی میں درپیش حالات کے تناظر میں شعر کہتا ہے لیکن اُس کی شاعری کا کوئی نہ کوئی بڑا محرک ضرور ہوتا ہے جس کا تاثر اُس کی شاعری سے ملتا ہے۔ صلاح الدین محمود نے اپنی کتاب ''مجید امجد کی داستانِ محبت'' میں مجید امجد کی شاعری سے ہی ''شالاط'' کو دریافت کیا اور داستانِ محبت لکھ ڈالی۔ احمد ندیم رفیع کی داستانِ محبت بھی اُس کی شاعری میں جابجا بکھری ہوئی ہے۔ ''وہ حُسنِ سخن آرائی'' سے محبت میں مبتلا ہوا اور آج بھی اُس کے کنجِ ساعت کی طرف کوئی زیبائی کا گلدستہ لیے آتا ہے۔

کوئی دل کش آواز جو غیب سے آئی اور اُس کی سماعتوں میں رچ بس گئی ہے۔ یہ آواز اُسے اپنے ہونے کا یقین دلاتی ہے۔ اس کی زندگی کی سب رعنائیاں اسی حُسنِ سماعت سے وابستہ ہیں اور یہی آواز اُس کی شاعری کا پیش خیمہ اور محرک ہے جس کے بارے میں وہ کہتا ہے:

مثالِ پیکرِ تصویرِ جاں مزین ہے
نگار خانۂ ارژنگ میں تری آواز
یہ حرف و صوت کی رنگینیاں تھیں بے معنی
اگر نہ گھولتا ان میں تو سرمئی آواز

احمد ندیم رفیع شعر کی دلکشی متاثر کیے بغیر اپنا مدعا بیان کرنے پر قادر ہے۔ دیکھیں اُس نے شاعری کے کینوس پر کس طرح آواز کو مجسم کیا ہے اور ان دیکھے محبوب کی سرمئی آواز کو اس طرح رنگوں میں گھول دیا ہے کہ حرف و صوت کی رنگینیاں معنویت کا مکمل اظہار بن کر رہ گئی ہیں۔ اردو شاعری میں ''سرمئی آواز'' کی بازگشت میں نے احمد ندیم رفیع کے ہاں پہلی بار سنی ہے۔ اسی طرح کی نئی تراکیب اور باکمال شعری بنت اور ماحول سے وہ قاری کو حیران ہی نہیں کرتا بلکہ اُس کے دل میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب بھی ہوتا ہے

اسی تناظر میں چند مزید اشعار ملاحظہ کیجیے:

رس گھولتی ہوئی تری آواز کان میں
کب تک سنوں یہ ساز ذرا سامنے تو آ

....

لمس، آواز، رنگ و بو کی طرح
روح تک ذائقہ اُسی کا تھا

....

مرا جواب نہیں حرف و صوت کا پابند
نظر ملا کے نظر سے کبھی سوال تو کر

....

رات خموشی، در، دستک
اک مانوس، صدا اور میں

صوفی تبسم نے بھی شاعری کا جواز محبت کو قرار دیا ہے۔

دل تبسم کسی کو دے پہلے
مفت میں شاعری نہیں ہوتی

احمد ندیم رفیع بھی اس کا اعتراف بخوشی کرتا ہے:

ہم آشنائے حرف و معانی نہ تھے مگر
حسنِ خیالِ یار نے شاعر بنا دیا

احمد ندیم رفیع محدود ڈکشن کا شاعر نہیں ہے۔ اُس کی شاعری کا پھیلاؤ ذات سے کائنات تک ہے۔ وہ اپنی شاعری میں دونوں دنیاؤں کو تسخیر کرنے کی سعی

CamScanner

کرتا ہے۔اُس کی نظر کسی ایک منظر پر نہیں ٹھہرتی بلکہ پس دیوار اور فلک کے پار بھی دیکھتی ہے۔وہ خیال یار سے بیگانہ ہوئے بغیر اپنی تمام ذمہ داریوں کا نہ صرف ادراک رکھتا ہے بلکہ اُن کو بااحسن طریقے سے نبھاتا بھی ہے۔وہ کاروبارِ دنیا میں باعزت اور کاروبارِ عشق میں سرخرو ہے۔وہ کہتا ہے:

دور اُفق پار ترے دیدۂ کم خواب کے ساتھ
شبِ ہجراں کا سفر خیز ستارہ بھی ہے
اپنے ایوانِ تخیل میں سجایا ہے نہیں
اک مجسمے کی طرح تجھ کو تراشا بھی ہے

سرور عالم راز غزل کے اہم ناقد ہیں۔اساتذۂ فن میں ان کا شمار ہوتا ہے۔وہ احمد ندیم رفیع کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ندیم پیشے سے ڈاکٹر ہیں، لیکن اردو زبان و ادب کا بہت اچھا شعور رکھتے ہیں۔ان کی غزلیات سے ظاہر ہے کہ زبان و بیان پر ان کو کافی قدرت حاصل ہے۔ان کے پاس الفاظ کی بھی کمی نہیں ہے اور ان کی نشست و برخاست سے بھی آپ بخوبی واقف ہیں۔ندیم نے اردو زبان وادب کے شوق میں ادیب فاضل کی سند حاصل کی ہے اور ان کا کلام اس بات کا شاہد ہے کہ یہ سند محض دکھانے کے لیے نہیں لی ہے۔بلکہ اس سلسلہ میں حاصل کی گئی معلومات کا صحیح استعمال بھی شاعری میں کیا گیا ہے چنانچہ آپ کی غزلوں کی زبان صاف، شستہ اور فصیح ہوتے ہوئے عام فہم بھی ہے اور ہر قسم کے مضامین کو نئے الفاظ سے سجانے اور سنوارنے میں معاون ہے۔وہ غزل کی پرانی اقدار اور روایات سے بخوبی واقف معلوم ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ان کی کوشش ہے کہ غزل گوئی میں اپنی راہ الگ نکالی جائے۔اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی اس کوشش میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔''

احمد ندیم رفیع نے ادبی دنیا کے ہنگاموں سے دور اپنی تنہائی کو شعر وادب سے آباد کر رکھا ہے۔اُس کے پیش نظر صرف اچھا شعر ہے اس کے علاوہ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا ہے۔اسی لیے اتنا اچھا شاعر ہونے کے باوجود آج تک اُس نے اپنے اشعار کی تشہیری مہم نہیں چلائی اور نہ ہی اپنی شاعری کا ڈنکا بجانے کے لیے کوئی اوچھا ہتھکنڈہ استعمال کیا ہے۔جیسا کہ مشاعرہ باز شاعروں کا وطیرہ ہے۔وہ الگ تھلگ رہ کر صرف شعر کے ساتھ اپنی کمٹ منٹ کو نبھا رہا ہے۔کیونکہ وہ اس بات کا بخوبی ادراک اور شعور رکھتا ہے کہ اچھا شعر خوشبو کی طرح ہوتا ہے اور خوشبو کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اُس کی شاعری قاری کا دامن پکڑتی ہے اور اُسے احساس کے نئے ذائقوں سے آشنا کرتی ہے اور وہ داد دیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔چند اشعار مزید دیکھئے:

چشم صبح نشاط پر اب بھی
قرض باقی ہے شامِ گریاں کا

....

بھٹک رہے تھے غلط فہمیوں کے غار میں ہم
چٹان شک کی ہٹائی تو راستہ نکلا

....

ابھی ظاہر ہے اور ابھی پنہاں
رگِ فطرت ہے رم غزالاں کا

....

میخانۂ نگار میں ہر ساغرِ خیال
بھرتی ہے تیری بہکی ہوئی چشم نیم باز

....

کیسی بہار آئی ہے اب کے دیار میں
بادِ صبا خفا ہے تو خوشبو گریز پا

....

تو بھی نہ کہیں ساتھ مرا چھوڑ گیا ہو
اس ڈر سے کبھی میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا

احمد ندیم رفیع کی شاعری کے بہت سے شیڈز ہیں۔کئی زاویے ہیں۔وہ ایک ڈگر کا شاعر نہیں کہ آنکھیں بند کیے زندگی بھر اُس پہ چلتا رہے۔وہ اپنی غزل کو کرافٹ اور مضامین کی سطح پر نت نئے تجربوں سے آشنا کرتا رہتا ہے۔یہ دو شعر دیکھئے:

جس پہ چل کے کبھی منزل پہ نہیں پہنچے ہم
اُسی رستے پہ سفر بادِ دگر کیا معنی

....

دم بخود گم سم کھڑی ہے آئنے کے سامنے
خود کلی حیران ہے اک پھول بن جانے کے بعد

رفیع آئے روز نت نئی زمینوں، مشکل بحروں اور منفرد ردیفوں میں طبع آزمائی کرتا رہتا ہے۔غزل میں ردیف کو نبھانے کی خوبی اُس کے اندر بدرجہ اتم موجود ہے۔اُس کی جن غزلیات کی ردیفیں ''کیا معنی''، ''ترے گیسو''، ''گل بدنی''، ''چشم نیم باز''، ''ذرا سامنے تو آ''، ''کتابی کتابی'' اور ''آواز'' اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ردیف آئینے پر مشتمل اُس کی غزل سے میں صرف تین شعر یہاں پیش کرتا ہوں۔

یہ کیا ستم ہے کہ بے چہرگی کے موسم میں
سجے ہوئے ہیں سرِ راہ گزار آئینے
نقاب اوڑھ کے بیٹھا ہوں عکسِ کاذب ہے
مری تلاش میں ہیں بے شمار آئینے
پڑے ہوئے ہیں سرہانوں پہ نیم خوابیدہ
چُرا کے تیری نظر کا خمار آئینے

احمد ندیم رفیع کو طویل غزلیں کہنے پر بھی ملکہ حاصل ہے۔احمد مشتاق کے ایک طرحی مصرعے پر اُس نے پچاس شعر کہے اور اس طرح کہے کہ حق ادا ہو گیا۔اس طرح اُس کی ایک مسلسل غزل جو دُعائیہ اشعار پر مشتمل ہے کافی طویل ہے۔اُس کے دو شعر:

اے خدا زیست کا ہنر بھی دے
مجھ کو ادراک خیر و شر بھی دے
آرزو گر اُڑان کی بخشی
ذوقِ تجدید بادل و پر بھی دے۔

احمد ندیم رفیع آج کا ہی نہیں کل کا شاعر بھی ہے۔''کل'' جو کہ فیصلہ کرے گا کہ منظر پہ کون رہے گا۔احمد ندیم رفیع کا ایک شعر جو مجھے بہت پسند ہے اس کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔

آخری رات گزاریں گے اسی خیمے میں
ہم کہیں بھیس بدل کر نہیں جانے والے

CamScanner

عالمی سطح پر اردو زبان کا بڑھتا رجحان

ثوبیہ شاہ/ فیصل آباد

تمام تعریفیں اس باری تعالیٰ کے لیے ہیں۔ جس نے نہ صرف مجھے قلم پکڑنا سکھایا بلکہ اس کی طاقت سے ذہنِ انسانی کو اجاگر کیا۔ لفظوں کی موتیوں سے پروئی گئی مالا اس قدر بیش قیمت ہوتی ہے کہ اہلِ فہم کے لیے اس سے خوبصورت تحفہ کوئی نہیں ہو سکتا یہ الفاظ ہی ہیں جو آدمی کو انسانی درجے پر فائز کرتے ہیں۔ اپنے مقالہ کے لیے جس موضوع کا انتخاب کیا وہ" عالمی پیمانے پر اردو زبان کا بڑھتا رجحان" اردو زبان ایک نئی زبان ہے جس کی تاریخ چند صدیوں سے زیادہ نہیں بنتی۔ اس زبان کا اپنے وطن سے باہر پھیلاؤ اس کی اہمیت کا سب سے بڑا سبب ہے۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد اردو زبان کو 25 فروری 1948 قومی زبان کا درجہ دے دیا گیا۔ اردو زبان کا تذکرہ ان ہستیوں کے ذکر کے بغیر نامکمل تصور کیا جاتا ہے۔ جنہوں نے اردو ادب کے لیے پاکستان میں اردو زبان کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان میں علامہ اقبال، مولوی عبدالحق، مستنصر حسین تارڑ، فیض احمد فیض، انتظار حسین، سعادت حسن منٹو، مشتاق احمد، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر تحسین فراقی، پطرس بخاری کے نام قابل ذکر ہیں۔ اردو دنیا کی تیسری سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ اقوام متحدہ میں اردو زبان کو دوسری زبانوں انگریزی، فرانسیسی، اطالوی، چائنیز کی طرح دوسری زبان کا درجہ دے دیا گیا۔ اس وقت اردو زبان پاکستان کے علاوہ انڈیا، ایران، بنگلہ دیش، مصر، ترکی، جاپان کی یونیورسٹیوں میں اردو کے مضامین پڑھائے جا رہے ہیں۔ ان کے بارے میں اپنے مقالے میں تفصیل سے ذکر کروں گی۔ تاکہ پاکستان اور دوسرے ملکوں میں اردو ادب کے طلباء اس سے استفادہ حاصل کر سکیں۔ ان شخصیات کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر لازم ہے جنہوں نے اس مقالے کی تکمیل میں میری مدد کی۔ پاکستان سے ڈاکٹر اقبال کاسران شاہد، ڈاکٹر مقبول حسن گیلانی، ایران سے ڈاکٹر علی بیات، انڈیا سے شاعر و ادیب امیر نہٹوری اور مصر سے ڈاکٹر احمد محمد احمد عبد الرحمن القاضی ہیں۔ مضمون میں سینئر صحافی۔ کالم نویس و مدیر اخبار اردو و شریک مرتب کتاب" پاکستان میں اردو" (پانچ جلدوں میں) ادارہ فروغ قومی زبان محترم تجمل شاہ کا شکریہ ادا کرنا اس لیے بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ اس مضمون کو لکھنے میں ان سے مشاورت گاہے بگاہے لیتی رہی بلکہ میری مضمون نگاری کا سہرا انہی کے سر ہے

1۔ پاکستان میں اردو زبان اور ادب

جن دنوں پورے برصغیر کا مسلمان ایک الگ وطن کا خواب دیکھ رہا تھا۔ یہاں کا ترقی پسند ادیب اپنے ہی ڈھب سے سوچ رہا تھا۔ ایک الگ وطن کا خیال اس کے میں کس قسم کا جوش پیدا نہیں کر رہا تھا تاہم قیامِ پاکستان کے بعد ادھر بھی ترقی پسندوں نے نئے نئے موضوعات کا در اردو ادب پر کھول دیا۔ یہ سوال بھی عین اس زمانے میں آیا تھا کہ کیا پاکستان کا ادب اپنے مزاج کے اعتبار سے تقسیم سے پہلے والے ادب سے مختلف ہونا چاہیے؟ اور کیا ادب کو قومی شناخت کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے؟ تقسیم سے پہلے کا اردو ادب ہند اسلامی مشترکہ تہذیب کا نمائندہ تھا، تاہم قیامِ پاکستان کے بعد اس کا رشتہ، یہاں کی زمینی روایت کے ساتھ ساتھ فرد کی روحانی تاریخ کے مظاہرے سے شعوری طور پر جڑتا چلا گیا۔ یہی سے ایک کشمکش کا آغاز بھی ہوا کہ یہ بات ترقی پسندوں کو ایک آنکھ نہ بھا رہی تھی، خیر واقع یہ تھا کہ ادب کے مزاج میں اگر ایک طرف یہاں کی ہزاروں سالہ تاریخ کام کر رہی ہے تھی تو اس کے قلب میں یہ سوال بھی موجود تھا کہ اس کی جڑیں کہیں اور سے روحانی اور فکری غذا پا رہی ہیں۔ یاد رہے کہ وہ ادیب جو تقسیم کے حامی نہ تھے اور انسان انسانیت کے ساتھ بہت سختی سے وابستہ تھے، ایک وقت ایسا آیا تھا کہ وہ ادیب بھی ہندوستان چھوڑ کر پاکستان آنے پر مجبور ہو گئے تھے، شائد اس لیے کہ یہیں ان کے باطنی تخلیق کار کی تکمیل ممکن تھی۔ منٹو ہی کہانی" کھول دو" کو کچھ لوگ کسی اور نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر مجھے تو یہ بھی اس کے پاکستانی ہونے کی روداد سناتی ہے۔ سینتالیس سے ساٹھ تک کے زمانے کے ادب میں اس ماضی کی گونج صاف طور پر سنی جا سکتی ہے۔ حتی کہ انتظار حسین پر تو اسی ناسٹلجیا کا شکار ہونے پھبتی بھی کسی جاتی رہی۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ انتظار حسین جیسے ادیب محض ماضی کے قریب سے وابستہ نہیں ہوئے تھے وہ ہند اسلامی تہذیب سے وابستہ ہو کر کچھ خواب دیکھ رہے تھے، چاہے یہ خواب" آخری آدمی" کی صورت میں ہی کیوں نہ ہوں۔

یوں مجموعی سطح پر دیکھا جائے تو ادب ایک نئے تصور سے جڑا اور زبان کے اندر اظہار کی بے پناہ قوت پیدا ہوئی۔ تخلیقی زبان لکھنے کی اس لگن کے زمانے میں جہاں نظم مختلف ہو گئی تھی وہاں ہمارا افسانہ بھی اس سے اثر قبول کر رہا تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ہمارے ہاں سب کچھ" نیا" ہو گیا تھا۔ نیا افسانہ، نئی نظم، نیا ادب حتی کہ غزل بھی نئی۔ ان دنوں سرحد کے پار بلراج مین را نے" ماچس" لکھا تھا اور سریندر پرکاش نے دوسرے آدمی کا ڈرائینگ روم" تو ادھر پاکستان میں انور سجاد نے" ماں اور بیٹا" رشید امجد نے" گملے میں آ گا ہو شہر" لکھے تھے۔ احمد ہمیش نے" کہانی مجھے لکھتی

ہے"۔ لکھی حتی کہ کہانی کی روایت سے جڑے ہوئے منشا یاد جیسے افسانہ نگاروں نے بنئے بھی اس چلن میں لکھنا قبول کر لیا تھا، کہ اس زمانے میں اس میدان میں قدم گاڑھے بغیر توجہ پانا ممکن ہی نہ تھا۔ تاہم جب اس نئی لہر سے یکسانیت کی بو آنے لگی، اور یہ تحریک فیشن زدگی کا شکار ہو گئی تو قاری اور ادیب میں مغائرت در آئی۔ دلچسپ مشاہدہ یہ رہا کہ قیام پاکستان کے بعد ترقی پسندوں کا ہدف غزل رہی جب کہ غزل نے انہی ترقی پسندوں کے لحن کو قبول بھی کیا اور کلاسیکی روایت کو بدل جانے دیا۔ قیام پاکستان کے وقت صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، حفیظ جالندھری، احسان دانش، مجید امجد، میرا جی، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ساقی فاروقی اور ضیا جالندھری اور دوسرے شاعر موجود تھے ایک تخلیقی انسان سمندر سہی مگر غزل ہی ایسی صنف رہی ہے جو انسان کو اس کے باطن کی گہرائی کی خبر دیتی ہے۔ ظفر اقبال تک آتے آتے غزل کے بدلنے اور نہ بدلنے کا سوال شدت سے سامنے آیا۔ اس سارے عرصے میں ناصر کاظمی، احمد مشتاق، رسا چغتائی، سلیم احمد، محبوب خزاں، منیر نیازی، جون ایلیا، عطا شاد، احمد فراز، توصیف تبسم، ریاض مجید، افتخار، بیدل حیدری، علی مطہر اشعر، خورشید رضوی، جلیل عالی، عبیداللہ علیم، اظہار الحق، عدیم ہاشمی، محسن احسان، فیصل عجمی، خالد اقبال یاسر سے خالد احمد اور غلام حسین ساجد تک مجھے جیسے جیسے نام یاد آتے جا رہے ہیں لکھتی جا رہی ہوں۔ پاکستان میں اردو زبان و ادب کا تذکرہ ان ہستیوں کے بغیر نامکمل تصور کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو زبان کو پروان چڑھانے اور آسان الفاظ میں پیش کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو زبان و ادب کے لیے بہت ساری کتابیں لکھی۔ جن کے نام "تاریخ ادب اردو" اس کتاب کے دو ایڈیشن 1984 تا 1987 میں شائع ہوئے "میراں جی ایک مطالعہ" 1991۔ "محمد تقی میر" 2001۔ "معاصر ادب" 1996۔ "تنقید اور تجربہ" 1989۔ "ایلیٹ کے مضامین" 2000 اور ان کے علاوہ بہت ساری کتابوں کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا شمار اردو کے بہترین ادیبوں میں ہوتا ہے۔ 25 فروری 1948 کو پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا۔ اردو ادب کے لیے پاکستانی اساتذہ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر مل کر کام کر رہے ہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی زبان کے بعد اردو زبان دنیا کی سب سے زیادہ بولی جانے والی تیسری زبان ہے۔ اقوام متحدہ نے اردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا ہے۔ پاکستان کے اردو دان نے خیر مقدم کیا ہے۔ اس فیصلے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے تمام اردو دان نے اقوام متحدہ کا شکریہ ادا کیا ہے۔ انہیں امید ہے کہ اس فیصلے سے اردو زبان کے فروغ میں آسانی ہو گی۔ پاکستان کے تعلیمی ادارے اور یونیورسٹیاں اردو زبان و ادب کے لیے مختلف پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ اس جگہ میں یونیورسٹیوں کے حالیہ اساتذہ تذکرہ کریں گئیں۔ جو اردو زبان کی مزید بہتری کے لیے کام کر رہے ہیں۔

سرائیکی خطے کا فخر ممتاز ماہر تعلیم، شاعر، ادیب، دانشور، رائیٹر، محقق، مصنف، ٹی وی اینکر سمیت اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بے پناہ علمی صلاحیتوں اور خوبیوں سے مالا مال پروفیسر ڈاکٹر سید مقبول حسن گیلانی پاکستان سمیت دنیا بھر کے علمی و ادبی حلقوں میں اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ پروفیسر مقبول حسن گیلانی نے اپنی زندگی کو علم کے حصول اور تعلیم کے فروغ کے لیے وقف کر رکھا ہے آپ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ مقدمات (مرتبہ دیباچے، تصانیف شوکت مغل) سوکھے پندھ (درسیات) نروار (تحقیقی و تنقیدی مضامین، لعل موتی وغیرہ۔ کئی انٹرنیشنل کانفرس اٹینڈ کر چکے ہیں۔ 26 سے زائد تحقیقی مقالات شائع ہو چکے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر شاہد اقبال کامران جن کا تعلق شعبہ اردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے ہے۔ آپ کا تعلق صنعتی شہر مانچسٹر آف پاکستان فیصل آباد سے ہے۔ آپ ایک مایہ ناز استاد، اسکالر، مصنف، تجزیہ کار، اور دانشور ہیں۔ آپ پاکستان کے مختلف نیوز چینل پر بہترین تجزیہ کار کے طور پر نظر آتے ہیں۔ آپ نے ایم۔ اے۔ اردو اور ایم۔ فل میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے گول میڈل حاصل کیا۔ آپ نے پی ایچ ڈی ڈگری علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے مکمل کی۔ آپ نہایت پروقار، ذہین اور دلکش شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ نے اقبالیات کے موضوع پر چند کتابیں لکھی۔ اقبالیات درسی کتب میں اقبال کا تصور قومیت اقبال دوستی۔ آپ اردو ادب کے بہترین کالم نگار ہیں۔ چند کالم کے نام درج ذیل ہیں۔ اگست کے جزیرے سے واپسی، ساجد جاوید کی لسانی مطالعات، ہماری بیسویں صدی یعنی اقبال اور فیض۔ خدا کی بستی میں انسان کی تلاش۔

ایم۔ اے۔ اردو میں ڈاکٹر انیلا سلیم میری بہترین اور پسندیدہ استاد تھی۔ آج میں اردو ادب میں لکھنے کے جو قابل ہوں وہ ڈاکٹر انیلا سلیم کی مرہون منت سے ہوں۔ آپ ایک دلکش، ذہین و فطین اور اعلیٰ کردار شخصیت کی مالک ہیں۔ آپ کے چہرے پر ہمیشہ ایک خوبصورت مسکراہٹ رہتی ہے جو آپ کی پروقار شخصیت کا خاصہ ہے۔ آپ نے ایم۔ اے۔ اردو، ایم فل، ڈگری اورینٹل کالج لاہور پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ جن اداروں میں پڑھایا، اسلامیہ انگلش سکول ابوظہبی، پنجاب کالج گلبرک لاہور، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج فار گرلز سیٹلائٹ ٹاؤن گوجرانولہ، اسٹنٹ پروفیسر، یونیورسٹی

آف ایجوکیشن فیصل آباد کیمپس۔ اسٹنٹ پروفیسر، ادارہ زبان وادبیات اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ ڈاکٹر انیلا سلیم اورینٹل کالج لاہور سے تعلق رکھنے والی استاد محقق ونقاد ہیں۔ پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری "جابر علی سید حیات اور ادبی خدمات" کے عنوان سے ڈاکٹر بصیرہ عنبرین کی زیر نگرانی مقالہ لکھ کر اورینٹل کالج لاہور سے ڈگری حاصل کی۔ جابر علی سید کے فن وفکر اور ادبی کارناموں کے حوالے سے اب تک ان کی دو کتب "اصول انتقادیات ادبیات ایک تنقیدی جائزہ از جابر علی سید" تروین تدوین کے حوالے سے اور" جابر علی سید حیات اور ادبی خدمات" منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کی دلچسپی کا میدان مشاہیر کے خطوط، تحقیق اور تدوین ہے۔

اردو کے استاد زبیر بخاری البرکت ڈگری کالج خان پور رحیم یار خان میں پڑھاتے ہیں۔ آپ کا تعلق رحیم یار خان سے ہے۔ آپ کے اردو ادب کے حوالے سے مختلف آرٹیکل شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں عبدالرحمن آزاد کا شخصی تعارف۔ بہاول پور کی ادبی تحریکات کا جائزہ وغیرہ۔

پروفیسر شعبان رانا یونیورسٹی آف ایجوکیشن ٹاؤن شپ لاہور میں ایک استاد کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ پروفیسر شعبان رانا کا تعلق ضلع جہلم سے ہے۔ آپ اردو ادب کے حوالے سے بہت مفید اور معلوماتی گفتگو کرتے ہیں۔ جن سے طلباء کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ آپ منفرد شاہانہ اور خوبصورت شخصیت کے مالک ہیں۔

2۔ انڈیا میں اردو ادب کا مقام

اردو ایک جدید ہندی آریائی زبان ہے۔ اس شہرت اور مقبولیت روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے یہ زبان دنیا کے اہم ممالک میں اپنا ایک خاص مقام حاصل کر چکی ہے۔ اپنی ادبی وعلمی، ثقافتی، تفریحی اور تعلیمی دائروں کے ذریعے پھل پھول رہی ہے۔ انگلستان، روس اور امریکہ جیسے ممالک سے بھی اردو خبر نامے رسالے نکل رہے ہیں اور کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ جرمنی جاپان مارینشس اور مغرب وسطی جیسے ممالک میں اردو کے آثار نظر آتے ہیں۔ ہندوستان میں اس زبان کے فروغ اور ارتقاء کے لیے خاص کوشش کی جارہی ہیں۔ ویسے ہندوستان بہت سی زبانوں اور بولیوں کا ملک ہے بعض ہند آریائی اور دڑاوی زبانیں بہت ترقی یافتہ ہیں اور اپنے ادبی اور علمی خدمات سے ہندوستان کی ترقی کے سلسلہ میں بہت اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ اردو زبان کا شمار بھی انہیں اہم زبانوں میں ہوتا ہے۔ جو کم عمر ہونے کے باوجود اپنی وراثت میں گراں قدر اور قیمتی تہذیبی، علمی، ادبی ورثہ لیے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی صد ہاں سالوں کی تاریخ اس زبان کے ذریعے محفوظ ہوگی ہے۔ زمانے کے تغیرات کی خوبصورتی اور عبرت ناک داستانیں اس کی گود میں پڑی ہوئی ہیں۔ انگریزوں کی غلامی سے نجات کی مکمل کہانی اس زبان کے ذریعے محفوظ ہوگی ہے۔ انگریزوں کے ہندوستان اور اس کے پڑوسی ممالک پر مکمل تسلط کے بعد انگریزی زبان نے اپنے ملک کی زبانوں کو پس پشت ڈال دیا تھا، مگر غلامی سے نجات کے بعد ہر ملک نے اپنی زبان کی طرف توجہ کی۔ ہندوستان نے اپنی زبانوں کے فروغ کے منصوبے بنائے۔ چند زبانوں کی ذمہ داری صوبائی حکومتوں کو سونپی گئ اور چند زبانوں کی ترقی و ترویج کی ذمہ داری بٹ گئ اور چند زبانوں کی ترویج کا کام مرکزی سرکار نے خود اپنے پاس رکھا۔

اردو کا شمارہ بھی مرکزی حکومت کے تحت ترقی پانے والی زبانوں میں ہوتا ہے۔ ہندی کی طرح اردو بھی ایک سے زیادہ صوبوں میں متروج زبان ہونے کی وجہ سے اس کی ترقی وترویج کی ذمہ داری میں بٹ جاتی ہے اور صد ہال سے نجی ادارے، رضا کار تنظمیں، اردو کی خدمت کرتے آئے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی برابر جاری ہے۔ مرکزی حکومت ہند اور اس کے صوبائی حکومتیں رضا کار تنظمیں، نجی ادبی ٹرسٹ، کثیر تعداد میں ادارے، انجمنیں اردو کے فروغ کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ ان سب کی جہات کار بعض امور میں یکساں ہیں۔ ترقی اردو بیورو کے لیے ترقی اردو بورڈ ایک اعلیٰ مشاورتی کمیٹی ہے۔ جس کا چیئرمین وزیر تعلیم ہوا کرتا تھا۔ اور ملک بھر سے علوم جدیدہ، دیگر سائنسی، سماجی علوم اور اردو زبان وادب کے ماہرین اور مرکزی حکومت کی نگرانی میں چلنے والی دوسری زبانوں کے سربراہوں پر مشتمل ترقی اردو بورڈ کی یہ کمیٹی تشکیل پاتی ہے۔ پروفیسر کلیم احمد مرحوم کی ادارت میں انگریزی، اردو لغت پانچ جلدوں پر مشتمل تیار کی ہے اور یہ اشاعت کے مدارج طے کر رہی ہے پانچ پانچ جلدوں پر مشتمل اردو۔ اردو بڑی لغت اردو، انگریزی لغت تیاری کے مراحل سے گزر رہی ہے۔ بیورو سے نوراللغات کا نیا ایڈیشن، اور فرہنگ آصفیہ کا دوسرا ایڈیشن کا بہت جلد شائع ہونے والا ہے دیگر سرکاری ادارے جو دوسری زبانوں کے ساتھ اردو کے بھی کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ان میں یہ زیادہ نمایاں ہیں۔ نیشنل بک ٹرسٹ (دہلی)، ساہتیہ اکیڈمی (دہلی)※ پبلیکیشن ڈویژن (دہلی)، سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن (دہلی)

خدا بخش لائبریری پٹنہ (صرف اردو)

سالار جنگ میوزیم کا کتب خانہ (حیدر آباد)

شعبہ تعلیم بالغان (دہلی) وغیرہ

انڈیا میں آج کی اردو اور پہلے دور کی اردو میں بہت فرق آگیا ہے۔ انڈیا میں آہستہ آہستہ اردو زبان مرتی جارہی ہے۔ کچھ ماہ پہلے مہاراشٹر کی ایک سیاسی جماعت شیوسینا میں دو دھڑنے ہونے کے بعد ایک کیس سپریم کورٹ آف انڈیا میں گیا۔ کیس کی سماعت کے دوران 43:2 منٹ کا ایک کلپ جو کہ اردو کے متعلق تھا سوشل میڈیا پر کافی وائرل اور موضوع بحث رہا۔ دوران بحث مہاراشٹر گورنر کے وکیل تشار مہتا نے چیف جسٹس کو

مخاطب کرتے ہوئے بشیر بدر کا یہ شعر پڑھا۔

میں چپ رہا تو اور غلط فہمیاں بڑھیں
وہ بھی سنا ہے اس نے جو میں نے کہا نہیں

اس پر ذرا دیر کے لیے عدالت میں قہقہہ بلند ہوا چیف جسٹس ڈی وائی چندرا چود جو عمومی طور پر انگریزی میں بات کرتے ہیں۔انہوں نے دہرا کر اس میں اپنی دلچسپی ظاہر کی اور اردو میں پوچھا کہ اس کا شعر اس قانونی بحث میں کیا مطلب ہے اور یہ کس کا شعر ہے۔ تشہار مہتا نے جواب دیا کہ" یہ اردو زبان کا شعر ہے۔ (انہوں نے اسے غلطی سے وسیم بریلوی کا شعر کہہ دیا تھا)۔اس پر چیف جسٹس نے ادھوٹھا کرلے کے وکیل درکن راجیہ سبھا کپل سبل کو بھی گفتگو میں شامل کیا۔کپل سبل نے کہا کہ اردو ایک خوبصورت زبان ہے لیکن اب یہ مر رہی ہے۔اور یہ حقیقت ہے۔ہم اپنا کلچر کھو رہے ہیں۔"

حالیہ اعداد وشمار تو بتاتے ہیں کہ وکی پیڈیا پر برصغیر میں بولے جانے والی مصروف زبانوں میں سب سے زیادہ آرٹیکلز اردو میں دستیاب ہیں۔آج کے دور میں کاروبار زندگی تیزی سے ڈیجیٹلائز ہو رہا ہے۔سادہ اور سلیس الفاظ میں ٹیکنالوجی کی مدد سے گاہک تک اپنے مواد کو پہچانے کو ڈیجیٹلائزیشن کہا جاتا ہے۔دیگر کاروبار زندگی کی طرح صحافتی نیز پڑھائی لکھائی کے امور بھی اسی سمت پر چل رہا ہے۔ ابلاغ میں عوام کون سی زبان زیادہ پسند کرتے ہیں۔یا کس زبان میں پڑھائی لکھائی کا کام زیادہ ہو رہا ہے یا کون سی زبان زیادہ ترقی کر رہی ہے اس کو ماپنے کے تین طریقہ کار ہیں۔پہلا اخبارات اور کتابیں ہیں کہ کس زبان میں کتنے اخبارات چھپتے اور بکتے ہیں۔ دوسرا ٹی وی پروگرام،عوام کون سی زبان میں زیادہ پروگرام دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔تیسرا ڈیجیٹل ذریعہ اس کا مطلب کہ کس زبان میں آن لائن کتنا مواد ہے موجود ہے۔جس میں جتنے زیادہ آرٹیکلز یا مواد دستیاب ہوگا۔اس کا مطلب اس میں بہتر کام ہو رہا ہے۔ معروف انگریزی اخبار میں "دی ہندو" میں ویگنیش رادھا کرشن نے وکی پیڈیا پر دستیاب آرٹیکلز پر اعداد وشمار پیش کیے ہیں ان کی اعداد وشمار کے مطابق دنیا کی مشہور 320 زبانوں میں وکی پیڈیا پر دستیاب آرٹیکلز میں سب سے زیادہ آرٹیکلز انگریزی میں دستیاب ہیں۔اس میں کل آرٹیکلز کی تعداد 6لاکھ 71 ہزار 236 ہے۔حیران کن طور پر انگریزی کے بعد دوسرا نمبر فلپائن کی ایک علاقائی زبان سیبابوکا ہے جس میں کل 61لاکھ 23ہزار 197 آرٹیکلز دستیاب ہیں۔

دنیا کی دوسری مشہور زبانوں میں جرمن 6.28 لاکھ،سویڈش میں 25.1 لاکھ،ڈچ 21.2 لاکھ،اور فرانسیسی (3.25) لاکھ زبانوں کا نمبر آتا ہے۔چینی زبان میں دستیاب آرٹیکلز کی تعداد 13.6 لاکھ ہے۔ انڈیا میں آئینی تسلیم شدہ زبانوں میں اردو سر فہرست ہے جس کو وکی پیڈیا پر آرٹیکلز کی دستیابی میں سبقت حاصل ہے۔اردو دستیاب آرٹیکلز کی تعداد 1.9 لاکھ۔ اس کے بالترتیب ہندی (1.57 لاکھ)، تامل (54.1 لاکھ)،اور بنگلہ (4.1 لاکھ) کے نمبر آتے ہیں۔

ان میں دو زبانیں پنجابی اور سندھی پاکستان کے دو صوبوں کی بھی بالترتیب پنجاب اور سندھ کی سرکاری زبانیں ہیں۔بنگالی کو بھی انڈیا میں آئینی حیثیت حاصل ہے۔انڈیا کی ریاست مغربی بنگال کی ریاستی زبان کے علاوہ یہ بنگلہ دیش کی سرکاری زبان ہے اردو بھی انڈین آئین کے آٹھویں شیڈول میں شامل زبانوں میں سے ایک ہے۔یوں تو اردو کا خمیر انڈیا ہے لیکن 1947 میں تقسیم برصغیر کی وجہ سے اردو بھی تنازعے کا شکار ہوگئی۔انگریزوں کے وقت اردو جو بلا مزہب انڈیا میں بولی جاتی تھی اور انڈیا کی مخلوط زبان یا جگت بھاشا سمجھی جاتی تھی انڈیا میں مسلمانوں کے ساتھ جوڑ دی گئی۔اردو ایک ہندی آریائی زبان ہے اور اس کے ارتقاء کے متعلق سب سے ٹھوس نظریہ مسعود حسین خان کا مانا جاتا ہے۔اس تھیوری کے مطابق اردو دہلی ونواح دہلی کی بولیوں سے مل کر وجود میں آئی۔دہلی کے نواح کی بولیاں جن سے خمیر سے اردو تیار ہوئی برج بھاشا،کھڑی بولی،ہریانوی،قنوجی اور میواتی ہیں۔

یوں تو اردو صدیوں پہلے وجود میں آچکی تھی،اور انڈیا کی لنگوا فرانکا کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ابتدا میں اس کی ترویج میں دکن کی سلطنتوں کا بڑا کردار ہے۔ انیسویں صدی اردو کی ترویج کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔انڈیا میں اردو زبان آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی ہے۔اردو رسم الخط کی جگہ ہندی رسم الخط نے لے لی ہے۔جو انڈیا میں جو مشاعرہ کیا جاتا ہے۔ اس مشاعر کے پمفلٹ اردو کی بجائے ہندی زبان میں لکھے جاتے ہیں جو سراسر غلط بات ہے۔انڈیا میں اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے بہت سے اساتذہ اور شعراء اپنا کام کر رہے ہیں۔انڈیا سے اردو کے شاعر و ادیب امیر نہٹوری اور ان کے ساتھی اس مہم کے خلاف آواز اٹھائے ہیں۔اردو زبان کا المیہ شہر در شہر اٹھ رہا ہے اردو زبان وتہذیب کا جنازہ افسوس نام نہاد ان اردو والوں پر ہے۔بے ضمیری،بے حیائی،مفاد پرستی ،خود نمائی ،چاپلوسی اور احساس کمتری کی وبا اس قدر حاوی ہے کہ اپنی زبان وتہذیب کا استحصال اب ان کے لیے باعث فخر ہے۔اس میں شامل وہ اردو نام والے شعراء اور ادباء جو اردو زبان کی بدولت شہرت اور عزت دولت بٹور رہے ہیں۔اس میں شامل بڑی بڑی اونچی ٹوپیاں پہنے والے جو بظاہر بڑے عالم فاضل نظر آتے ہیں۔ان میں شامل نام نہاد قومی رہبر جنھیں اپنی مادری زبان پر فخر ہے مگر افسوس اپنی شناخت مٹانے میں یہی پیش پیش ہیں۔اردو زبان و ادب کی تاریخ مرتب کرنے والوں سے اپیل ہے،کہ اردو کی تباہی و بربادی کی تاریخ کو لاگو کیا جائے اور ان

CS CamScanner

اردو فروشوں کو سر فہرست شامل کیا جائے۔ محبانِ اردو اپنی نسلوں کو ان کے نام اور فوٹو دکھا کر ان کی زبان کی بربادی کرنے میں ان کے بارے میں ضرور بتائے تاکہ نسل در نسل اردو زبان کی تباہی کے اسباب سے متعارف ہوتے رہیں۔ آج کل اردو زبان انڈیا کے اتر پردیش اور جموں کشمیر میں بولی جاتی ہے۔ اردو زبان کو اتر پردیش میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ جموں کشمیر میں اردو کو پہلی سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔

3۔ ایران کے تعلیمی اداروں میں اردو زبان کا وجود

اسلامی جمہوریہ ایران (عرف عام: ایران، سابق نام: فارس، موجودہ فارسی نام: جمہوری اسلامی ایران) جنوب مغربی ایشیا کا ایک ملک ہے، جو مشرق وسطی میں واقع ہے۔ ایران کی سرحدیں شمال میں آرمینیا، آذربائیجان اور ترکمانستان، مشرق میں پاکستان اور افغانستان اور مغرب میں ترکی اور عراق (کردستان علاقہ) سے ملتی ہیں۔ مزید خلیج فارس اور خلیج عمان بھی واقع ہیں۔ ملک کا سرکاری مذہب اسلام اور فارسی قومی زبان ہے۔ ملک کی کرنسی ریال کہلاتی ہے۔ ایران مشرق وسطی میں واقع ہے۔ اس کے شمال میں آرمینیا، آذربائیجان، ترکمانستان اور بحیرہ قزوین، مشرق میں افغانستان اور پاکستان، جنوب میں خلیج فارس اور خلیج اومان جب کہ مغرب میں عراق اور ترکی واقع ہیں۔ ملک کا وسطی و مشرقی علاقہ وسیع بے آب و گل صحراؤں پر مشتمل ہے جن میں کہیں کہیں نخلستان ہیں۔ مغرب میں ترکی اور عراق کے ساتھ سرحدوں پر پہاڑی سلسلے ہیں۔ شمال میں بھی بحیرہ قزوین کے ارد گرد زرخیز پٹی کے ساتھ ساتھ کوہ البرس واقع ہیں۔

اس اہم اور جدید ٹکنالوجی سے آراستہ و پیراستہ ملک کی شرح خواندگی 97 فیصد ہے۔ جدید آلات اور جدید کھوج پرکھ کے ساتھ زبان وادب اور ثقافت میں دل چسپی ایرانی باشندوں کے اندر ایک اہم خصوصیات ہیں۔ ان خصوصیات کا اعتراف ارباب علم وفکر کو ہے۔ ڈاکٹر علی بیات کا ایک تحقیقی مقالہ ''ایران میں اردو زبان کا مختصر تاریخی پس منظر'' ہے۔ ایران میں اردو زبان وادب کی صورت حال پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر علی بیات لکھتے ہیں:

''برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی مشترکہ زبان اور شاید صحیح الفاظ میں اس خطے کے باشندوں کی اکثریت کی مشترکہ زبان یعنی اردو، ایران میں طویل مدت تک، بڑی حد تک ناشناختہ رہی۔ اس ملک میں اردو کو ایک زبان کے طور پر روشناس کرنے والوں میں ایک اہم نام سید محمد تقی فخر داعی گیلانی (1879-1964) ہے۔ انہوں نے 1905 میں ہندوستان کا سفر کیا اور 15 سال کے قریب وہاں قیام کیا۔ اس دروان مختلف علما و دانشوروں سے ان کی ملاقاتیں رہیں اور کچھ عرصہ علی گڑھ میں فارسی، عربی اور فلسفے کی استادی کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔ اس دوران انھوں نے شبلی نعمانی کی "شعر العجم"، "الکلام"، "سوانح مولانا روم"، "کتابخانہ اسکندریہ" وغیرہ جیسی چند اہم کتابیں کو اردو سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح انہوں نے سرسید احمد خان کی "تفسیر القرآن" کو بھی فارسی کا جامہ پہنایا۔ یوں انہوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں، ایران میں اردو زبان کے تعارف کے سلسلے میں اپنا کردار ادا کیا۔ لیکن اس سے اس زبان کو وہ شہرت حاصل نہ ہوسکی جس کی ضرورت تھی۔ ان کے بعد ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی (1917-1990) کا نام اس سلسلے میں بہت اہم ہے۔۔۔ اس سلسلے کی ایک اور اہم کڑی ڈاکٹر شہریار باحیدر نقوی مرحوم ہیں۔ جن کی "اردو، فارسی لغت" اپنے دور کو مدنظر رکھتے ہوئے، بہت اہم کارنامہ شمار ہوتا ہے۔ مرحوم کچھ عرصہ اصفہان یونیورسٹی اور دانشگاہ تہران سے وابستہ رہے اور اس دوران بہت سے علمی تحقیقی مقالات لکھے جو ایرانی اور پاکستانی جرائد و رسائل میں چھپتے رہے۔ ان کی خدمات کے سلسلے میں دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب آگے جاکر 1991 میں شعبہ اردو، دانشگاہ تہران کا قیام عمل میں آیا تو ان ہی کی ذاتی لائبریری جو اردو زبان میں منتخب ادبی اور علمی کتابوں پر مشتمل تھی، غیر ملکی زبانوں کے کالج کی مین لائبریری کی زینت بنی۔ یہ کتابیں ڈاکٹر شاہد چوہدری کے ذریعے، مرحوم کی بیوہ سے اس لائبریری کے لیے خریدی گئیں۔'' (1)

اردو زبان وادب کی تعلیم و تدریس کا اہتمام ایران کی صرف ایک یونیورسٹی ''تہران یونیورسٹی'' میں ہے۔ تہران یونیورسٹی اپنی گوں ناگوں خصوصیات اور تعلیم و تدریس کے ساتھ انتظامی امور میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہے۔ ایران کے نامور اور مشہور ومعروف دانش گاہوں میں ''تہران یونیورسٹی'' کا نام سرفہرست ہے۔ تہران یونیورسٹی میں اردو زبان وادب کی تعلیم و تدریس کی ابتدا کیسے ہوئی؟ تہران یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کا قیام کب اور کیسے عمل میں آیا؟ ان سب پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر علی بیات لکھتے ہیں:

''دانش گاہ تہران کا ایک مشہور کالج، فارسی زبان وادب کے کالج میں بی اے اور ایم اے فارسی، کی سطح کے طلبا کے لیے اردو زبان ایک اختیاری مضمون کے طور پر ابتدائی اور بنیادی واقفیت کی حد تک کئی برسوں تک پڑھائی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید شہریار باحیدر نقوی لکھتے ہیں: 'دو سال ہوگئے ہیں (مطلب سنہ 1955) کہ یونیورسٹی آف تہران میں، اردو کا شعبہ قائم ہوا ہے۔ فارسی زبان و ادب اور علوم معقول و منقول کے کالج میں سینکڑوں طالب علم بڑے شوق سے اردو کی تعلیم میں مصروف ہیں۔۔۔ جب سے اس شعبہ کا افتتاح ہوا ہے، اہل علم کی توجہ کا مرکز بنا ہے۔' یوں دانش گاہ تہران میں، اردو اور اس کی طرف توجہ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ لیکن

CS CamScanner

بدقسمتی سے ڈاکٹر صاحب کی کوششوں کے باوجود، مذکورہ کالج میں کبھی یہ شعبہ مستقل طور پر جاری نہ رہ سکا اور بہت جلد گوشہ گمنامی میں چلا گیا۔ اس وقت کے نصاب میں اردو کے حروف تہجی کے تعارف کے بعد، عام اور سادہ فقرے کی مشق کی جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ طلبا و طالبات معمولی بول چال کی حد تک اردو سے واقفیت حاصل کر لیتے تھے۔ ڈاکٹر شہریار یا حیدر نقوی مرحوم جیسا ایران میں مقیم پاکستانی استاد کے علاوہ پاکستان سے آئے ہوئے پی ایچ ڈی فارسی کے طلبا وغیرہ، ایرانی طلبا اور شائقین کے لیے استادی کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ یہ سلسلہ کئی سال جاری رہا۔ لیکن بالآخر 1990 میں ایران اور پاکستانی حکومتوں کے درمیان سرکاری سطح پر، ایک باقاعدہ معاہدہ ہوا، جس کی رو سے یہ طے پایا کہ بی اے آنرز کی سطح پر دانشگاہ تہران میں اردو زبان و ادب کا شعبہ قائم کیا جائے۔ (2)

اس اقتباس سے تہران یونیورسٹی کے ساتھ ایران میں اردو زبان و ادب کی تدریس اور اردو ممالک کی معاونت کا ذکر موجود ہے۔ ڈاکٹر علی بیات چوں کہ خود شعبۂ اردو، تہران یونیورسٹی، تہران میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ چناں چہ موصوف کا تجربہ بھی کافی وسیع ہے۔ موصوف نے تفصیلی طور پر تہران یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے قیام اور اردو کے لیے جدوجہد کرنے والے افراد کے احوال و کوائف درج کیا ہے۔ ایران میں اردو زبان کی تعلیم و تدریس کی معلومات کے لیے پروفیسر علی بیات کے مذکورہ اقتباسات یقیناً بنیادی ماخذ ہیں۔

تہران یونیورسٹی، ایران میں تعلیمی سرگرمیاں یہ ہیں کہ اس وقت شعبۂ اردو، تہران یونیورسٹی، تہران میں اردو زبان و ادب کی تعلیم و تدریس کا بندوبست دو سطح پر جاری و ساری ہے۔

1۔ بی۔ اے آنرز اردو زبان و ادب

2۔ ایم۔ اے اردو زبان و ادب

واضح رہے کہ ایران کی تمام یونیورسٹیوں میں بی اے آنرز کی تعلیم کا دورانیہ چار سالوں پر مشتمل ہوتا ہے جو آٹھ سمسٹرز پر محیط ہے۔ اس دورانیہ کو سمت و رفتار دینے کے لیے باضابطہ نصاب تیار کیا گیا ہے۔ اس نصاب کے تحت طلبا و طالبات درس گاہ کی پابندی کو لازمی جز سمجھ کر حاضر ہوتے ہیں۔ پاکستانی اساتذہ کے بعد اس وقت خود ایرانی النسل اساتذہ نے شعبے کی ذمہ داری خود سنبھالی ہیں۔ اب جب کہ خود ایرانی الاصل اساتذہ نے شعبے میں اپنی اپنی خدمات انجام دینے کے اہل ہو گئے ہیں، اردو کے نصاب کو نئے سرے سے بنانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ نصاب کی تیاری میں ممکنہ حد تک خامیوں کو دور کرنے کی کوشش جاری ہے۔ وزارت تعلیم اسلامی جمہوریہ ایران کے قانون کی رو سے ہر پانچ سال جامعاتی نصابوں کو تشکیل نو کے مراحل سے گزارنا ناگزیر ہوتا ہے۔ وزارت تعلیم کی ہدایت کے مطابق شعبۂ اردو کی بھی یہی کوشش رہتی ہے کہ شعبے میں زیر تعلیم طلبا و طالبات کے ادبی ذوق و شوق کا بھرپور خیال رکھا جائے۔ ساتھ ہی جدید اور رائج وسائل سے استفادہ بھی کیا جائے۔ اس استفادہ کے عمل میں ہندوستان اور پاکستان کی مشہور و معروف یونیورسٹیوں کے نصاب کا عمل دخل بہت حد تک ہوتا ہے۔ ہندو پاک کے اردو شعبوں کے نصاب کی مدد سے شعبۂ اردو، تہران یونیورسٹی کافی استفادہ کرتے ہیں۔ اس سے ایک سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایرانی طلبا و طالبات اردو کے مولد و مسکن کی تعلیمی و تدریسی ڈھانچوں سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

بی اے آنرز اردو زبان و ادب، کے نصاب کچھ اس طرح ہیں۔

آٹھ سمسٹرز میں سے، پہلے چار سمسٹرز کو زبان کی تعلیم کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ اس دوران اردو گرامر تین سمسٹرز میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ اردو بول چال جس میں طلبا کے اردو حروف و الفاظ کے سننے، تلفظ، اور حروف کی ادائیگی پر زور دیا جاتا ہے۔ گرامر کی رو سے ان سے سیدھے سادے مضامین لکھوائے جاتے ہیں، اس طرح وہ مختلف الفاظ کو اردو محاوروں اور روزمرہ کے مطابق استعمال سے آگاہی کے ساتھ مشق کرائے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ چوتھے سمسٹر سے ترجمے کے بنیادی اور ابتدائی اصول و قواعد کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ سادہ متون کو اردو سے فارسی میں اور فارسی سے اردو میں ترجمے کے اصول کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ طلبا کو پاکستانی اور ہندوستانی اسکولوں میں مروجہ نصابی کتب کے بعض مضامین کے منتخب حصے ان چاروں سمسٹرز کے ذریعے کلاسوں میں پڑھایا جاتا ہے۔

پانچویں سمسٹر سے آٹھویں سمسٹر تک، دراصل طلبا و طالبات کا زبان آموزی کا دورانیہ مکمل ہوتا ہے اور وہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اردو ادب کی نظم و نثر کا تفصیلی مطالعہ کر سکیں۔ نظم کی ابتدائی اصطلاحات کی تعریف سے لے کر نظم کے قدیم و جدید اصناف اور اردو شاعری کے کلاسیکی اور جدید دور کی شاعری کے منتخب حصے پڑھائے جاتے ہیں۔ نثر میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ابتدا میں طلبا کے لیے نثر اور اسالیب نثر کی اصطلاحات کی وضاحت کی جاتی ہے اور اس کے بعد دور قدیم و جدید کے اہم نثر نگاروں اور فن پاروں کے منتخب حصے پڑھائے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تاریخ ادب اردو اور ادبی متون کے اعلیٰ نمونے پیش کیے جاتے ہیں اور اس طرح آٹھویں سمسٹر کے اخیر تک طلبا بڑی حد تک اردو زبان اور ادب سے واقف ہو جاتے ہیں۔

ایران میں ایم اے اردو کے تمام طلباء کو تھیسس لکھنا لازم ہے۔ شعبے کی ضروریات اور طلبا کی قابلیت

کو پیش نظر رکھتے ہوئے، تھیسس کے لیے موضوعات کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ طلبا اور ساتذہ کے باہمی مشورے اور رضامندی کے مطابق کسی ایک موضوع کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اگر چہ یہ بات بھی ہمیشہ پیش نظر رہتی ہے کہ ایسے مقالات لکھے جائیں، جن سے شعبے کی تحقیقی ضروریات پوری کی جا سکے۔ مقالوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس لیے ذیل میں صرف بعض مقالوں کی فہرست، مقالہ نگار کا نام اور اخیر میں نگراں کا نام پیش کیا جا رہا ہے۔

علامہ اقبال اور پروین اعتصامی کی مکالماتی نظموں کا تقابلی اور تنقیدی جائزہ: مقالہ نگار، فرناز زالزادہ: نگراں، ڈاکٹر علی بیات

انتظار حسین کے منتخب افسانوں کا تنقیدی مطالعہ: مقالہ نگار، فاطمہ فخر الدین: نگراں، ڈاکٹر محمد کیومرثی

اردو میں فارسی کے چند منتخب الفاظ کا تقابلی جائزہ: مقالہ نگار، زہرا آذرخش: نگراں، ڈاکٹر علی بیات

فارسی بولنے والوں کو اردو قواعد کی تعلیم: مقالہ نگار، لیلا غالبی: نگراں، ڈاکٹر محمد کیومرثی

مثنوی معنوی میں مولانا روم کی کلیلہ و دمنہ اور پنج تنترہ سے اثر پذیری، ایک مطالعہ: مقالہ نگار، سیمین جوادی: نگراں، ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی

ترقی پسند تحریک کی افسانہ نگاری کا موضوعاتی مطالعہ: مقالہ نگار، منیرہ نژاد شیخ: نگراں، ڈاکٹر وفا یزدان منش

شعبۂ اردو، تہران یونیورسٹی ہر سال کئی علمی و ادبی نشستوں کا اہتمام کرتا ہے۔ ان نشستوں میں ہندو پاک اور ایرانی محقق و دانشوران کو مختلف علمی و ادبی موضوعات پر خطاب کے لیے مدعو کرتے ہیں جس سے تمام طلبا اور اساتذہ بہت استفادہ کرتے ہیں۔ نومبر میں تمام ایرانی یونیورسٹیوں میں ایک ہفتہ "ہفتہ پژوہش" کے نام سے منعقد ہوتا ہے۔ اس میں ہر ایک شعبہ اور ہر ایک استاد ایک سال کے دوران، اپنی علمی و ادبی تحقیقات کی وضاحت کرتا ہے۔

ڈاکٹر علی بیات اور ڈاکٹر محمد کیومرثی 1999 سے اب تک شعبے میں تدریسی خدمات کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس وقت شعبے میں پانچ مستقل اردو کے ایرانی اساتذہ موجود ہیں جو ہمہ وقت اردو زبان و ادب کی تعلیم و تدریس میں مصروف ہیں۔ (1) ڈاکٹر علی بیات (2) ڈاکٹر محمد کیومرثی (3) ڈاکٹر زیب النساء علیخان (2019 میں ریٹائرڈ ہو گئی ہیں) (4) محترمہ ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی (5) محترمہ ڈاکٹر وفا یزدان منش (6) ڈاکٹر علی کاووسی نژاد

ڈاکٹر زیب النساء علیخان کی تالیفات و تصنیفات درج ذیل ہیں:

1۔ "تصحیح انتقادی تذکرہ مجمع النفائس سراج الدین علی خان آرزو"

2۔ "زیب اللغات فرہنگ واژہ نامہ توصیفی اردو بہ فارسی"

3۔ "فرہنگ سہ زبانہ اردو، فارسی اور ہزارہ جامع اللغات سلطانی"

ڈاکٹر علی بیات کی تالیفات و تصنیفات درج ذیل ہیں:

1۔ "مطالعہ بیدل در پرتو افکار برگسون" (ترجمہ) اقبال اکادمی پاکستان 2000 (2006 میں یہ کتاب ایران سے "حقیقت و حیرت، مطالعہ بیدل در پرتو اندیشہ ہای برگسون" کے نام سے "پریشان خیال"، نامی ایک ایرانی انتشارات سے بھی چھپی ہے۔)

2۔ "زیب اللغات فرہنگ واژہ نامہ توصیفی اردو بہ فارسی"، (با ہمکاری دکتر خانم دکتر زیب النساء علیخان)

3۔ "نہضت تشکیل پاکستان" (ترجمہ)

4۔ "پنجرہ ای بہ سمت باغ گمشدہ" (ترجمہ منتخب اشعار افتخار عارف)

ڈاکٹر محمد کیومرثی کی تالیفات و تصنیفات درج ذیل ہیں:

1۔ "معاصر ایرانی شاعری"، ترجمہ 30 شعراز شاعران معاصر ایران بہ زبان اردو

2۔ "اردو فارسی افسانہ، تجزیاتی و تقابلی مطالعہ"

3۔ "گفتگو در سکوت/ترجمہ شعر معاصر اردو"

ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی کی تالیفات و تصنیفات درج ذیل ہیں:

1۔ "فرہنگ تلمیحات اشارات اساطیری، داستانی، تاریخی، مذہبی در زبان و ادبیات اردو۔ ہندی۔ بہ فارسی"

2۔ "منتخب نغمہ خداوندی گیتا"

3۔ "فرہنگ مہمان"

ڈاکٹر وفا یزدان منش کی تصنیف "نوسرایان اردو در سدہ بیستم" وغیرہ اردو زبان و ادب کے اساتذہ کی تالیفات و تصنیفات قابل ذکر ہیں۔ (جاری ہے)

فروغ ادب کے لیے وقف
بہ یاد: سید قاسم محمود
ماہنامہ بک ڈائجسٹ لاہور
bookdigest@hotmail.com
ISSN 2079-4584
مدیر اعلا: اظہر سلیم مجوکہ
mazharmajoka@yahoo.com
مدیر اعزازی: اظہر سلیم مجوکہ
azharmajoka@yahoo.com
برائے خط و کتاب/ترسیل زر
بک ڈائجسٹ
کتاب ورثہ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
0333-4377794

CamScanner

ظفر محی الدین کی ''درویش'' اور درویشیت

عبدالوحید بسمل/ایبٹ آباد

کسی انجینئر کا درویش اور درویشیت سے کیا تعلق، انجینئر کا کام ناپ تول کے کوئی ڈیزائین، کوئی پروجیکٹ، کوئی منصوبہ تیار کر کے ملک وقوم یا عوام الناس کی بہتری اور سہولت کیلیے پیش کر دینا ہوتا ہے، مگر جب کوئی انجینئر، ایک انجینئر ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر اور ادیب بھی ہو تو صورتحال مختلف ہوا چاہتی ہے۔ بالکل ایسی ہی جیسی کہ انجینئر ظفر محی الدین کی اردو شاعری کی مایہ ناز کتاب ''درویش'' کے مطالعے کے بعد سامنے آتی ہے۔ میرا ظفر صاحب سے کوئی لمبا چوڑا تعارف نہیں اور ان نہ ہی کے بارے میں ذاتی معلومات کا کوئی خزانہ رکھتا ہوں جس کے بل بوتے پر میں اپنے اس مضمون کی کوئی متاثر کن تمہید باندھ سکوں۔ البتہ ان کی کتاب ''درویش'' کے مشمولات کسی بھی قاری، مبصر یا ناقد کے معاون اور مددگار کے طور پر یوں سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں کہ جناب ظفر کا نہ صرف ادبی تعارف از خود ہوا چاہتا ہے بلکہ انکے اندر کے ایک باہمت و بامراد تخلیق کار، ایک پیر مردِ جہاندیدہ، ایک عالم و فاضل، ایک اعلیٰ سطحی قلم کار اور سب سے بڑھ کر ایک درویش کے مختلف رنگ، روپ اور چہرے چمکتے نظر آتے ہیں۔ اور پھر چلتے چلتے یہ رنگ کچھ اسطرح نمایاں ہوتے جاتے ہیں کہ اپنے اندر بلند و بالا تخیل، گہرے ادراک و وجدان، بلا کی فراست اور بے مثال علمی قمقموں کی چکا چوند اور زباں و بیاں کی معطر فضا قاری کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ یہ لپیٹ اول تا آخر نہ تو کہیں ڈھیلی پڑتی ہے اور نہ ہی کہیں فرار کا موقع دیتی ہے بلکہ ایک ایسی حلاوت اور مٹھاس کے ساتھ قاری کے ذوقِ مطالعہ میں اشتیاق اور اسکی قوتِ سخن فہمی کے امتحان کا سماں پیدا کر دیتی ہے۔ اور مجھ جیسا قاری ششدر رہ جاتا ہے کہ اس کتاب پر اپنے پیارے دوست اور معروف شاعر و ادیب جناب اعظم سہیل ہارون کے حکم کی بجا آوری کی جائے تو کیسے؟ کیونکہ اس کتاب میں محض قافیہ اور ردیف کے کمالات، الفاظ کا چناو اور زبان و بیاں کے معجزے، صنائع بدائع کا عمدہ استعمال، مختلف النوع بحور و اوزان کا برتاؤ ہی نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ ایسے ایسے موضوعات پر سہل ممتنع کے موثر اوصاف کے ساتھ قلم اُٹھایا گیا ہے کہ بلا خوفِ تردید صاحبِ کتاب کے درویشانہ طرز فکر اور اسلوب بیاں کو ''لاجواب'' کہا جا سکتا ہے۔

کتاب کی ابتدا حمدِ باری تعالیٰ سے ہوتی ہے:

وہ سب سے خوبصورت ہے
وہ سب سے ہے حسیں الحمد!
مثال اس کی نہیں کوئی
کوئی اس سا نہیں الحمد

ذکرِ حبیبِ خدا جب کرتے ہیں تو عقیدت اور نسبت کے جذبے سے سرشار:

اس لئے اتنے قرینے سے ہوا
میرا ہر کام مدینے سے ہوا

اس کے بعد حضرت علیؓ، امام عالی مقام حضرت امام حسینؓ اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حضور منقبت پھر اپنے ماں باپ کی خدمت میں نذرانہ محبت پیش کرتے ہیں۔ یہاں سے فیوض و برکات کیا سمیٹے ہیں کہ ان کا قلم اس روانی اور ہمت کی جولانی کے ساتھ رواں دواں ہوتا ہے۔ کہ قاری انکی علمی، فکری، اور تخیلاتی اڑان کو دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے، ویسے توں انھوں نے شاید ہی شعری حوالوں سے کسی موضوع کو تشنہ چھوڑا ہو مگر ان کے اس مجموعے کی زیادہ تر شعری روش تصوف اور روحانیت کی آئینہ دار نظر آتی ہے۔ ان کے میلانِ طبع کو دیکھا جائے تو اس میں ایک درویشیت ہے، شاید اسی لیے انھوں نے اس مجموعے کا عنوان بھی ''درویش'' ہی رکھنا مناسب خیال کیا ہے۔ مگر ان کے اس نظریئے کو جاننے کے لیے ہمیں انہی کے اشعار بطور حوالہ یہاں پیش بھی کرنے ہیں اور ذرا سا درویش اور درویشیت کی اصطلاح کی معنوی پرتوں پر بھی نظر ڈالنی ہے کہ درویش ہوتا کون ہے؟۔

لغوی اعتبار سے دیکھا جائے تو فقیر کے معنیٰ ہیں: خدا رسیدہ، صاحبِ کردار، صاحبِ معرفت، سادہ مزاج، غریب اور مسکین وغیرہ مگر اصطلاحی معنوں میں دیکھیں تو فقیر بہت بڑی ہستی سمجھی جاتی ہے۔ جس کے پاس رموزِ کائنات سے آشنائی، اپنے عمل اور فرمان سے انسان اور انسانیت کے دکھوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کا مداوا اور اخروی اسودگی بہم پہنچانے کا علم اور معرفت و ولایت کی مدد سے عوام الناس کی دینی، اخلاقی اور روحانی تشنگی مٹانے کا ہنر اور بصیرت ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام اوصاف ویسے ہی ہاتھ نہیں لگ جاتے، ان کے لیے بڑی ریاضت اور تزکیہ نفس کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک لمبی مسافت طے کرنے کے بعد ایک فقیر درویشی کے اوصاف حاصل کرتا ہے اور پھر اس کی زباں و بیان میں وہ تاثیر پیدا ہو جاتی ہے کہ دنیا والے حیران رہ جاتے ہیں۔

جناب ظفر بھی اپنی اس کتاب کے تناظر میں ایک ایسے ہی درویش کے مداح نظر آتے ہیں۔ وہ کہیں تو اپنے لیے درویشانہ نگاہوں کے فیض کے متلاشی دکھتے ہیں اور کہیں وہ اس درویش کے روپ

میں بذاتِ خود اصلاح معاشرہ کی سعی ہامراد میں سرگرداں دیکھے جاسکتے ہیں۔اس حوالے سے ان کے اس مجموعے میں شاید ہی کوئی غزل ایسی ہو جس میں درویش اور درویشیت سے متعلق کوئی شعر نہ ہو۔اور یہی وہ مقام ہے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو تخلیق کار مسلسل کسی درویش کا مداح اور اس کی نظرِ فیض کا متلاشی ہے دراصل اس کے اپنے اندر "درویشیت" بدرجہ اُتم موجود ہے۔چند اشعار دیکھیے:

تُو اگر نہیں ہے تو میرے چارسُو کیا ہے؟
ہوش والے کیا جانے جام کیا سبو کیا ہے؟

....

میں بے طلب تھا سو جس نے مانگی
اسی کی جانب اچھالی دنیا
جو ترک دنیا کیے ہوئے ہیں
ہے ان کی خاطر تو گالی دنیا

....

ان سے پوچھ حقیقت کیا ہے دنیا کی
گلیوں میں جو پھرتے ہیں دیوانے سے

....

مجھے کوئی بھی خود پر بار مت سمجھے
مرا دو چار دن کا تو پڑاؤ ہے

....

آنکھیں کھولوں تو وہ پاس نہیں ہوتا
آنکھیں موندوں تو وہ ہر سُو ہوتا ہے

'یہ چند نمونے کے اشعار جنابِ ظفر کی درویشیت کے ثبوت کے طور پر پیش کیے گئے ہیں جب کہ درویشوں سے ان کی محبت اور انس و دلچسپی کا اندازہ ان کے ان اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔:

جنید و شبلی و عطار سے الفت
مجھے منصور سے بے حد لگاؤ ہے

....

چین آتا نہیں کہیں بھی مجھے
پاس اپنے بٹھا لیجئے مرشدا!
یاد رہ جائے صرف رب مجھ کو
باقی سب کچھ بھلائیے مرشدا!

یوں تو جناب ظفر کے اس مجموعے پر صرف درویش اور درویشیت کے حوالے سے ہی ایک دقیق مقالہ پیش کیا جاسکتا ہے مگر ہر کتاب کا ایک اپنا تقاضا بھی ہوتا ہے کہ کم از کم اس کے اہم پہلوؤں پر ضرور بات کی جائے۔چنانچہ مزید شعری شعادتیں پیش کیے بغیر یہ کہاس جاسکتا ہے کہ "درویش" کے مندرجات میں زندگی سے تعلق رکھنے والے کم بیش سبھی موضوعات کو جنابِ ظفر نے زیرِ قلم لانے کی عمدہ کوشش کررکھی ہے۔ جن میں سماجی شعور، عالمی تناظر، قضیہ ہائے زیست، عشق مجازی، ہجر و وصال کی اہمیت اور حقیقت، بے حسی و بے رغبتی زمانہ، ڈیجیٹل وار کے اثرات، مصنوعی ذہانت سے پیدا ہونے والے علمی، منطقی و فلسفیانہ حلقوں میں دیکھا جانے والا اضطراب، خانگی زندگی کی بنیادوں کا کمزور ہونا اور اپنی سالہا سال سے چلی آنے والی ثقافت و کلچر سے بے رغبتی اور اسکے مضمرات، اسلامی امہ کی عظمتِ رفتہ کا نوحہ اور نشاطِ ثانیہ کی تگ و دو، سبھی کچھ اس کتاب کے موضوعات میں شامل ہے۔ مزے کی بات یہ بھی ہے کی صاحب کتاب نے اس کا اسلوب نہایت سادہ اور زباں عام فہم رکھی ہے جو کہ قاری کی معاون و مدد گار ثابت ہوتی ہے۔ اس درویش صفت شاعر کی کتاب پر یہ مضمون انہی کے اس شعر پر اختتام پزیر ہوتا ہے۔

سورج مزاج شخص سے کیا دوستی ہوئی
جس سمت میں نے دیکھا وہیں روشنی ہوئی

وہ اپنے شاخسانے پر جو ہوتا شرمگیں دیکھا
تو چھوڑا آستاں اس کا، پلٹ کر پھر نہیں دیکھا
خمار آلود فکروں نے نیا نقشہ تراشا ہے
کرے سیراب گلشن کو وہ چشمہ بھی کہیں دیکھا؟
محبت خون کرتی ہے انا کا، خود پرستی کا
نکالا جس کو محفل سے وہ آ بیٹھا وہیں دیکھا
بڑی عظمت ہے محنت میں، نہ مانو تم تو پھر مانو
کہ اک پتھر کو محنت سے تراشا تو نگیں دیکھا
یہاں پر دن بسر کرنے بڑا محتاط رہنا ہے
بنا سوچے جو بولا پھر چھپاتا وہ جبیں دیکھا
سمایا اس طرح میری وہ آنکھوں میں کہیں آ کر
بہت دیکھے حسیں لیکن نہ اس جیسا حسیں دیکھا
فقیری میں مراتب کی عجب تقسیم ہے بسمل
جو پانی بھر کے لاتا تھا وہی مسند نشیں دیکھا

عبدالوحید بسمل/ایبٹ آباد

دھندلائے ہوئے دن کے اُجالے کی طرح ہوں
دیوار پہ ان اٹکے ہوئے جالے کی طرح ہوں
اے اہلِ نظر مجھ کو ذرا غور سے دیکھو
محفل میں کسی چاند کے ہالے کی طرح ہوں
اک درد کا طوفاں مرے سینے میں چھپا ہے
خاموش زباں پر لگے تالے کی طرح ہوں
دیکھو مری آنکھوں میں اگر مے کی طلب ہے
ساقی کے چھلکتے ہوئے پیالے کی طرح ہوں
ڈھائے ہیں ستم گردش ایام نے لاکھوں
میں دھنکی ہوئی روئی کے گالے کی طرح ہوں
ہو سکتا ہے اک پل میں فنا میرا سراپا
برسات میں گرتے ہوئے ژالے کی طرح ہوں
بچ جاؤ شگفتہ مری ترچھی سی نظر سے
میں زہر میں ڈوبے ہوئے بھالے کی طرح ہوں

شگفتہ گل/کوٹ رادھا کشن

بیانیہ اور پاکستانی بیانیہ

ڈاکٹر سائرہ بتول

ڈاکٹر ذوالقرنین احمد ادبی دنیا میں شاداب احسانی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ 92 نیوز کے لیے ان کے لکھے گئے کالموں کو 2022 میں مرتب کیا گیا جو کہ پاکستانی بیانیے کی وضاحت کرنے اور بیانیہ اور پاکستانی بیانیہ جیسے موضوع کی جانب قاری کی توجہ دلانے ک باعث بنا۔

ڈاکٹر زکیہ رانی نے اس کتاب کو 2022 میں حلقہ شاداب احسانی، کراچی کے زیر اہتمام مرتب کیا۔ بیالیس کالموں کے س مجموعے کا انتساب" پاکستان کے نام" ہے۔ کتاب" بیانیہ اور پاکستانی بیانیہ"شاداب احسانی کی علمی وسعت، قابلیت اور محققانہ نظر کا منھ بولتا ثبوت ہے شاداب احسانی احسان دانش کے شاگرد بھی تھے۔ انھوں نے دنیا کی مشکلات اور پریشانیوں کو دیکھنے والی نظر اپنے استاد سے حاصل کی اور ہر گام کامیابی حاصل کی۔ موصوف کا کہنا ہے کہ کسی بھی قوم کا بیانیہ کے بغیر ترقی کرنا ممکن نہیں۔ اگر کسی ملک کے لیے اپنا بیانیہ اہم نہ ہوتا تو امریکیوں کو کبھی اپنے بیانیے کی ضرورت نہ پڑتی۔ شاداب احسانی اپنے الموں کے ذریعے پاکستانیوں کو اس بات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں کی بیانیہ کے بغیر قومیں بالکل اس طرح ہیں جیسے ڈارک ایجز کا دور تھا۔ ڈاکٹر شاداب احسانی جو شاعر، ادیب، کالم نگار، استاد اور دانشور ہیں اور پاکستانی بیانیے کے سب سے بڑے وکیل ہیں۔ انھوں نے اپنے کالموں میں پاکستانیت کے حوالے سے جو بحثیں کی ہیں وہ ان کا منفرد کارنامہ ہے۔ یہ کتاب اپنے مندرجات کے لحاظ سے بھی مختلف ہے۔ کتاب کے آغاز میں دس مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے مصنف، کتاب اور اس موضوع کے بارے میں خیالات اور تاثرات ہیں ان تمام اشخاص نے ڈاکٹر صاحب کی پاکستانیت اجاگر کرنے کی خواہش اور پاکستانیوں کو ایک نئی سوچ دینے کی کوشش کو سراہا ہے۔ اس کتاب میں شامل انٹرویو تمام کالموں کا خلاصہ ہے۔ شاداب احسانی نے تمام شعبہ ہائے زندگی میں نئے بیانیے کی ضرورت اور اس کے تعارف کی صورت و امکان پر بحث کی ہے۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ ان کی تمام چھیڑی گئی بحثیں آج ادبی دنیا میں اہم موضوع بن گئی ہیں ان کے درد منددل نے قوم کو اپنی پہچان اور شناخت بنانے پر جس طرح راغب کیا ہے وہ ایک تاریخی کارنامہ ہے۔

کتاب میں پہلے تاثرات محمود شام کے ہیں انھوں نے پاکستان کی ڈائمنڈ جوبلی پر احسانی صاحب اسے قوم کے لیے نئی فکر کا تحفہ کہا ہے۔ اس کی ترویج کے لیے احسانی صاحب کا مشورہ ہے کہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں اس پاکستانی بیانیے کو اپنانے کے لیے مطلوبہ راستہ اختیار کیا جائے۔ درسگاہوں میں ایسے نصاب ترتیب دیئے جائیں، سیاسی جماعتوں کے منشور، والدین کے لیے اولاد کی تربیت کے اہتمام میں اسے بطور خاص شامل کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ قومی زبان کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کو، علاقائی ثقافتوں کو پروان چڑھانے اور ان کے احیا کے لیے کام کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

سعید خاور نے پاکستانی تشخص کی تلاش اور شاداب احسانی کے موضوع سے پاکستانی بیانیے کی حیثیت گم ہونے کی وجوہات میں کہا ہے کہ ڈاکٹر شادانی کو موقف ہے کہ بیانیہ قوموں کو استوار کرتا ہے اور قومیں اپنے بیانیے کی بدولت ریاستیں مستحکم کرتی ہیں۔ ہمارا بیانیہ فرقوں اور گروہوں کے سبب اپنی صلاحیت کھو بیٹھا نتیجہ یہ ہے کہ شناخت کھو گئی۔ انھوں نے شادانی صاحب کی اس بات کی تائید کی کہ پاکستان اور اسلام دونوں ایک بیانیے کی بدولت ہیں۔ پاکستانی بیانیہ دراصل خدائی بیانیہ ہے یعنی وہی منشور جس کی طرف قائداعظم نے اشارہ کیا کہ اسلام کے اصولوں کے مطابق پاکستان کا نظام حکومت چلایا جائے۔ ڈاکٹر شادانی نے ملی بیانیے کو قومی بیانیہ بنانے پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبال کا بیانیہ ملی بیانیے سے نکلا اور پھر وہ پاکستانی بیانیے کی بنیاد بن گیا مگر آزادی کے بعد یہ بیانیہ اشرافیہ کی خود غرضیوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ہم ابھی تک اقبال کی غلامانہ فکر سے آزاد نہیں ہوئے۔ ہم کوئی ایسا مفکر یا فلسفی پیدا نہیں کر سکے جو انگریز کی دین ہے اور اشرافیہ نے اسے پوری قوم پر تھوپ دیا ہے۔ ان تمام موضوعات پر شادانی صاحب نے یورپی، افریقی اور ایشائی اقوام کا تقابل پیش کیا ہے اور ان کے بیانیے کی بدولت ان کی قومی زندگی پر اثرات کا جائزہ بڑی دانش مندی اور عرق ریزی سے کیا ہے۔

''علم انفارمیشن اور پاکستانی بیانیہ'' میں معیشت کے بیانیے کے اثرات کا جائزہ ان کے عمدہ مشوروں کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر شادانی نے ظہیر الدین بابر کے ازبکستان سے جڑے رہنے کے سبب ہندوستانی معاشرت، طرزِ تعمیر اور طرز زندگی میں تبدیلیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہمیں اپنے ملی بیانیے

سے جڑنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمیں احیا کی صورت پیدا ہو۔ میڈیا کردار ملکی بیانیے کی ترویج میں سب سے اہم ہے۔ ہمارے ثقافتی انحطاط کا سبب بھی پاکستانی بیانیے کا نہ ہونا ہے۔ ہمارا ادب اپنی دیو مالا سے محروم اور انگریزی شعری ونثری قصوں کا رہین بن چکا ہے۔ ''میں پاکستانی ہوں'' پہلا کالم ہے جس میں عملی جمہوریت پر زور دیا گیا ہے۔ مغربی طرزِ جمہوریت کو اپنانے سے گریز اور ان کے جمہوری بیانیے کو ترک کرنے میں نجات قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر شادانی نے کہا کہ چین و عرب ہمارا سے نکل کر اب پاکستان کی بات کی جائے تو حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔'' اشرافیہ، ریاست اور پاکستانی بیانیہ'' میں اشرافیہ کے بارے میں کہتے ہیں ''اشرافیہ ضابطے اور قانون بناتی ہے اس لیے ہمیں اشرافیہ کے چنگل سے نکلنا ہوگا'' اس کی وجہ یہ بتائی کہ اشرافیہ اپنے مفادات کی اسیر ہے۔

''اقبال، اردو غزل اور پاکستانی بیانیہ'' میں انھوں نے دلچسپ بات یہ کہی ہے کہ اقبال کی غزل کلچر کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اس لیے غزل کو پاکستانی بیانیے کی اساس بنانا ہوگا اور ادب میں اس پیغام کو عام کرنا ہے کہ تقلید کی روش سے تائب ہو کر اپنی دنیا آپ پیدا کریں۔

ادب سماج، بیانیہ اور پاکستانی بیانیہ'' میں انھوں نے بڑی دردمندی کے ساتھ یہ کہا کہ روحانی اقدار اور ثقافت کی بربادی کے لیے انگریزی کو رائج کیا گیا۔ اردو نے عوام اور اشرافیہ کے درمیان فاصلے کم کیے اور باہمی تفہیم کا ذریعہ بنی۔ اب اشرافیہ کے سبب ادب زوال کا شکار ہے۔ اشرافیہ کا بیانیہ غلامانہ ہے۔ ''سیاست، معاشرت بیانیہ اور پاکستانی بیانیہ'' میں انھوں نے ارتھ شاستر اور چانکیہ کا طرزِ حکومت بتایا کہ سیاست معاشرت سے جنم لیتی ہے مگر ہماری سیاست معاشرت کو برباد کر دیتی ہے۔ شاداب احسانی پاکستان کے متعلق کہتے ہیں کہ پاکستان عوام کا ہے لیکن وہ چلتا اشرافیہ کے حکم پر ہے۔ بالائی اور زیریں طبقے کے حوالے سے گہرا ناقدانہ رویہ اپناتے ہوئے معاشرے کی اصلیت کو بیان کرتے ہیں۔ پاکستانی بیانیہ کی ہونا چاہیے؟ کا جواب دیتے ہوئے وہ قاری کو اسکردو سے لے کر موہنجوڑو تک کی سیر کراتے ہیں اور تمام پرتیں کھولتے جاتے ہیں۔

شاداب احسانی بار بار اس بات کی جانب توجہ مبذول کرواتے ہیں کہ کوئی بھی قوم بغیر بیانیے کہ نہ تو پنپ سکتی ہے نہ ہی ترقی پا سکتی ہے۔ قائداعظم نے جس طرح بیانیے کے ذریعے قوم کو خوابِ غفلت سے جگایا اور انھیں الگ قوم کی حیثیت دلوائی شاداب احسانی قوم کی توجہ قائداعظم کے اسی مشن کی جانب دلانے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔شاداب احسانی جیسی غیر معمولی شخصیت نے قومی بیانیے کی بحث چھیڑ کر محققین کی توجہ اس جانب مبذول کی ہے تاکہ جو کم تری، محرومی کا احساس پاکستانی ہجوم کی جڑوں میں بیٹھ چکا ہے اسے جڑ سے اکھاڑا جا سکے۔

ان کا کہنا ہے کہ اگر پاکستان نظریاتی ریاست ہے تو خالص پاکستانی بیانیے کو جاننا ہوگا جو کہ خدائی بیانیہ ہے۔

شاداب احسانی کے نزدیک جب ہم پاکستانیت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس کی جڑیں جداگانہ مسلم تشخص کے حوالے سے دو قومی نظریے سے جا کر جڑ جاتی ہیں۔

انھوں نے اپنے کالموں میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ پاکستانی تہذیب کا گنگا جمنی تہذیب سے کوئی تعلق نہیں بلکہ ان کے نزدیک سندھ کی تہذیب و ثقافت کے تعلق مصر کی سمیری تہذیب و ثقافت سے جڑتا ہے۔

لسانی اعتبار سے دو قومی نظریے کو بیان کرتے ہوئے ان کا خیال ہے کہ اردو، فارسی اور عربی کا کوئی لفظ

ہندی سے مل کر نہیں بنتا۔ اپنی آرا کو مستند بنانے کے لیے جگہ جگہ حوالے، حواشی، سن اور تاریخ لکھتے ہیں جس سے ان کی محققانہ اور عمیق نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

راقمہ کا خیال ہے کہ شاداب احسانی مستقبل قریب میں پاکستانی بیانیہ کو ملک کے کونے کونے میں پھیلانے میں کامیاب ہو جائیں گے اور پاکستانی قوم جس کے لیے انھوں نے پاکستانی ہجوم کا لفظ استعمال کیا ہے اسے غفلت کی نیند سے بیداری حاصل ہوگی۔ خطرہ افتاد اور احساس محرومی سے نکل کر اس قوم میں ولولہ تازہ پیدا ہوگا۔

غرض یہ کہ تعلیم، معاش، ادب، جغرافیہ، سائنس، جمالیات ہر شعبے میں پاکستانی بیانیے ڈاکٹر صاحب نے جس طرح تحقیق و تجاویز پیش کی وہ ان کا منفرد کارنامہ ہے یہ کتاب ایک مثبت سوچ کے پروان چڑھانے کے لیے شعبہ ہائے زندگی کے لوگوں کے لیے رہنما کردار ادا کر سکتی ہے۔ اگر ہم ان خطوط کی رشنی میں اپنا قبلہ درست کر لیں اور اس بیانیے کی ترویج کے لیے کام کریں تو یقیناً قدر و منزلت پاکستانی بیانیے کا مقدر ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس نئے موضوع کو متعارف کروا کے ہم پر احسان کیا ہے۔

محمد امین ساجد سعیدی کی نعت: اظہارِ محبت سنتِ رسول ﷺ

ڈاکٹر احسان اللہ طاہر/گوجرانوالہ

محمد امین ساجد سعیدی کا تعلق پنجاب کے ایک شہر حاصل پور سے ہے۔ آپ اپنی نعت سے نعتیہ ادب میں اپنے خاص اسلوب اور پیرایے سے منفرد مقام بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔ آپ نے ابھی تک اردو کے نعتیہ ادب میں جو کچھ بھی لکھا ہے، اسے قومی سطح پر پذیرائی مل چکی ہے۔ بلکہ آپ کی ایک کتاب "مدینہ یاد آتا ہے" کو صدارتی قومی سیرت ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔ آپ نے ابھی تک جو کتب لکھی ہیں ان کی تفصیل کچھ یوں ہے:

''مدینہ یاد آتا ہے'' 2017ء
صدارتی قومی سیرت ایوارڈ یافتہ
"اے سیدِ لولاک" 2019ء
"شاہ ہست حسینؓ" 2019ء
"تجلیِ حسنِ ازل" 2021ء

"شاہ ہست حسینؓ" اہلِ بیت سے مودّت اور عقیدت کے اظہار کو لیے ہوئے ہے۔ اس میں، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، انہوں نے کربلا کے شہیدوں کے مناقب لکھے ہیں۔ خاص طور پر حضرت امام حسینؓ کی بارگاہ میں ہدیہ عقیدت پیش کیا ہے۔ مناقب اور سلام میں موصوف نے مبالغہ آرائی نہیں کی بلکہ عقیدت اور تاریخی سچائی کے ساتھ حقائق کو بیان کیا ہے۔ آپ نے امام حسینؓ کی سنت اور اہل بیت سے مودّت کا اظہار بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔ کتاب پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ آپ نے حضرت امام حسینؓ کی سیرت اور کربلا کی تاریخ کو دل کی آنکھیں کھول کر پڑھا ہی نہیں، سمجھا بھی ہے۔ جبھی تو آپ کہتے ہیں کہ:

رہتے ہیں جس سے منور روز و شب دل اور دماغ
نور ہو کیسے وہ مدھم حضرت شبیرؓ کا
(شاہ است حسینؓ، ص:97)

آپ کی اس کتاب کو لاہور سے فضل حق پبلیکیشنز کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔ اس کتاب کا انتساب شہزادیِ کونینؓ، دخترِ مصطفیٰ، زوجہ مرتضیٰ، حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کے نام کیا گیا ہے۔ باقی تینوں کتابیں آپ کی نعتیہ کتابیں ہیں۔ ہر کتاب کسی نہ کسی حوالے سے اپنی انفرادیت قائم رکھے ہوئے ہے۔ فکری اور فنی حوالے سے ان نعتوں کو ناقدین نے روایتی انداز سے ہٹ کر لکھی گئی نعتیں کہا ہے۔ "مدینہ یاد آتا ہے" جو کہ آپ کی پہلی نعتیہ کتاب ہے، اس میں 92 نعتیں ہیں جو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیارے نام "محمد ﷺ" کے اعداد ہیں۔ یہ نعتیں مکمل ہوش و خرد کے ساتھ لکھی ہوئی نعتیں ہیں۔ انہوں نے سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ محبت اور اس پر عمل پیرا ہو کر عشق کمانے کے عمل کو ہی نعت کہا ہے اور اسی نعت کی روشنی کو قبر کا اجالا اور روشنی کہا ہے۔ انہوں نے قبر کی وحشت کو رونق میں بدلنے کا جو تصور نعت میں دیا ہے وہ صرف زبانی دعویٰ نہیں ہے، بلکہ جو لوگ سچائی اور عشق کی اس منزل کو پہنچ جاتے ہیں، وہ ایسا ہی کہتے ہیں۔ "اے سید لولاک" میں آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کے حوالے سے 63 نعتیں لکھی ہیں۔ اس کتاب میں موصوف نے نسبتِ نعت کی روشنی اور نعمت کو بڑی محبت اور تکرار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ میلادِ مصطفیٰ کا بیان بھی اس کتاب میں اپنی منفرد پہچان کے ساتھ ہوا ہے۔ ان دونوں کتابوں کے حوالے سے آپ نے اپنے اشعار میں بھی اس بات کا اظہار کیا ہے۔

عمرِ اقدس تریسٹھ برس آپ کی، بس ہے نسبت یہی
یہ تریسٹھ جو نعتوں کا دیوان ہے، واہ کیا شان ہے
(اے سید لولاک، ص:64)

"تجلیِ حسنِ ازل" بھی آپ کی نعتیہ کتاب ہے۔ فنی اعتبار سے اردو ادب میں یہ کئی حوالوں سے منفرد اور روایت سے ہٹ کر لکھی گئی نعتیہ کتاب ہے۔ اس میں موصوف نے کل 53 نعتیں لکھی ہیں جو کہ آپ کے نام "احمد" کے اعداد ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے ہر نعت میں کسی نہ کسی صنعت کا استعمال کیا ہے۔ جیسے صنعت سیاق الاعداد، صنعت اشتقاق، فوق النقاط، واصل الشفتین، واسع الشفتین، تحتانیہ، صنعت متضاد یا تضاد، صنعت غیر منقوط وغیرہ۔

محمد امین ساجد سعیدی کی نعت کا فکری حوالے سے مطالعہ کریں تو ہمیں اس میں کئی فکری زاویے اور سوچوں کے دھارے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر سب سے مضبوط اور خوبصورت انداز ان کا اظہار محبت نسبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔

ہماری نعتیہ روایت میں جس طرح سے موصوف نے سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتیں کی ہیں، وہ بھی نعت ہی کا ایک زاویہ ہے۔ اس کو ناقدین عملی اور اعلیٰ نعت بھی کہتے ہیں کہ کوئی انسان اگر زندگی بھر سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل پیرا ہے اور اس کے پھیلاؤ اور اسے اجاگر کرنے کی بات کرتا ہے تو یقیناً وہ پہلے خود اس پر عمل پیرا ہوگا تو پھر اس کو تحریک بنا کر اپنی نعت کا حصہ بنائے گا کیونکہ مومن وہ بات نہیں کرتا جس پر وہ خود عمل نہیں کرتا۔

ساجد نے اپنی نعت کا باقاعدہ ان موضوعات کو شعوری طور پر حصہ بنایا ہے اور یہ وہ موضوعات ہیں جن کے بارے میں کسی نے کہا تھا کہ "با محمد ہوشیار"۔ ایک نعت گو شاعر کو اس بات کی خبر ہونی چاہیے کہ نعت صرف دعا، استغاثہ اور ذاتی معاملات کو بیان کرنے کا ہی نام نہیں ہے بلکہ حقیقی نعت سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذکر سے بنتی ہے۔ آپ کی باتوں کی خوشبو

کو پھیلانے سے بُنی جاتی ہے۔ آپ کی زندگی کے روشن گوشوں کے اُجالوں کو لوگوں کی زندگی کا حصہ بنانے اور فکر و خیال میں رچانے سے بنتی ہے۔ آپ نے اپنی ان تینوں کتابوں میں سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موضوعات کو تسلسل سے بیان کیا ہے اور پھر خاص طور پر ان گوشوں اور پہلوؤں کو جن کا تعلق انسانی زندگی کے ارتقاء اور سماجیات سے ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو بھی کیا، جو بھی کہا، سب کا مقصد انسانی معاشرے کو پرامن اور خوشحال بنانا تھا۔ کیونکہ جہاں معاشرہ پرامن ہوتا ہے وہیں خوشحالی آتی ہے۔ جس سماج میں انسانی اقدار کو اہمیت دی جاتی ہے۔ جہاں بلا رنگ و نسل ایک دوسرے کے لیے آسانیاں پیدا کی جاتی ہیں۔

امین ساجد کی نعت کا یہ پہلو ایک خوشبوئی پہلو ہے اور اس رنگ و خوشبو کو ہماری نعت کا لازمی حصہ ہونا چاہیے کہ اسی سے عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکو فروغ ملے گا۔ اسی سے نعت عملی رنگ میں ڈھلے گی۔ اسی سے ہماری نسلِ نو کو نعتیہ اشعار کی خوبصورتی کا پتہ چلے گا۔ امین ساجد نے جن پہلوؤں کو نعت میں نسبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکے حوالے سے بیان کیا ہے ان کا رنگ دیکھیں کہ وہ زندگی کے کتنا قریب ہیں۔ بلکہ وہ عمل خود زندگی ہے اور جیون بیزار لوگوں کو ایسے عمل سے حوصلہ ملتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی انسانوں کو مایوسی کا سبق نہیں دیا۔

رسول اکرم کی پاک سیرت ہمارے پیش نظر ہے ہر دم
امین ساجد ستم زدہ کا بھلا کریں گے، سدا کریں گے
(اے سید لولاک، ص:96)

فقط معیار تقویٰ ہے نہ گورا ہے نہ کالا ہے
بڑائی سرورِ عالم کے ہے افکار کی ہر سو
(تجلیٔ حسنِ ازل، ص:88)

سنتِ سرورِ عالم کے سبب ہم یارو!
رہ سے کنکر جو اٹھاتے ہیں، سکوں پاتے ہیں
(اے سید لولاک، ص:62)

پھر کرم مصطفیٰ ایسا فرمائیں گے، سب مقدر یقیناً سنور جائیں گے
ہاتھ سر پر یتیموں کے رکھا کرو، اپنے سینے سے ان کو لگاتے رہو
(مدینہ یاد آتا ہے، ص:63)

اس پہ خوش ہوتے ہیں سرکارِ دو عالم ساجد
جب بھی بھولے کو کوئی رستہ بتا دیتا ہے
(تجلیٔ حسنِ ازل، ص:121)

سیرتِ ساقیٔ کوثر سے ہوئی جس کو لگن
عاشقِ صادق ہے اچھا، نیک وہ انسان ہے
(تجلیٔ حسنِ ازل، ص:112)

رسولِ پاک کے اخلاق کی تعلیم کو سمجھو
زمانے میں ہے دیں پھیلا عداوت سے، نہ نفرت سے
(تجلیٔ حسنِ ازل، ص:118)

مشعلِ نعت سے نکلنے والی کرنوں میں سے عہد حاضر کو جس کرن کی ضرورت ہے وہ سماجی حوالے سے انسان کے نظریات کی شیرازہ بندی ہے اور نعت اس میں اہم بلکہ بنیادی کردار ادا کر سکتی ہے۔ نعت ایک ایسی قدر مشترک ہے جس سے آج کی نسل نے بہت سی امیدیں باندھ رکھی ہیں۔ تبلیغی اور بامقصد شاعری کے حوالے سے یہ عہد ایک نیا جنم لے رہا ہے اور ہمارے نعت گو شعراء جس قدر سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مطالعہ کریں گے اسی قدر ان کے اشعار میں تاثیر اور خوبصورتی پیدا ہوگی جو ان کے شعر کو بھی زندہ رکھے گی اور خیال کو سدا بہار حیاتی بھی دے گی۔

محمد امین ساجد نے اپنی نعت میں موضوعات کو تنوع پیدا کرنے کی بجائے کچھ خاص موضوعات کو یوں تکرار کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ان کے فنی حسن نے ان کی شاعری کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جو نعت گو شاعر جس قدر باعمل اور اہل علم میں شمار ہوگا اس کا شعر بھی اسی قدر اہل علم اور جاننے والوں کی محفل میں پذیرائی حاصل کرے گا۔ ذکر نعت درود و سلام ہماری نعت کا ایک ایسا پہلو ہے کہ یہ انہی لوگوں کی شاعری میں نظر آتا ہے جو زندگی کے کچھ خاص لمحات کو اس کے لیے وقف کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے درود و سلام کی برکات و ثمرات کو بعد از تلاوت درود و سلام بیان کیا ہے، منظوم کیا ہے ان لوگوں کے اشعار کے رنگ اور طرح کے ہیں۔ اس تجربے سے گذرنے والوں کے اشعار کی خوشبو زندگی بھر دل و جاں کو معطر کیے رکھتی ہے۔ امین ساجد کے ذکر نعت درود و سلام کے حوالے سے کہے گئے اشعار صرف اشعار نہیں ہیں بلکہ ان کے نظریات بھی ہیں اور تجربات بھی، ان کی قلبی واردات بھی ہے اور جذبے کی سچائی بھی۔ درودی لمحات کو جب امین ساجد شاعری میں ڈھالتے ہیں تو سہل ممتنع کی بحر کا استعمال زیادہ کرتے ہیں تاکہ تھوڑے لفظوں میں زیادہ اور بڑی بات کہی جا سکے۔ درود و سلام کو احادیث میں غریب کا صدقہ بھی کہا گیا ہے اور صدقہ بلاؤں کو ٹال دیتا ہے۔ دعا سے پہلے درود و سلام پڑھنے سے دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ درود و سلام پڑھنا جہاں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہے وہاں فرشتوں کی موافقت بھی اور انسان کی جملہ ضروریات کی تکمیل کے لیے علمائے کرام نے درود و سلام کو کافی قرار دیا ہے۔ یہ ہماری حاجات کی تکمیل کا باعث بنتا ہے۔ درود و سلام قیامت کے دن کی ہولناکیوں سے نجات کا سبب بھی بنے گا۔ اسی کی بدولت انسان کے نور میں اضافہ ہوگا جب وہ پل صراط پر ہوگا۔ اگر ہم اپنے دلوں میں عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شمع کو فروزاں کرنا چاہتے ہیں تو درود و سلام کو وظیفہ بنا لینا چاہیے کہ یہ وہ عبادت ہے کہ ادھر ہم پڑھ رہے ہیں اُدھر مالکِ یوم الدین قبول بھی کر رہا ہے۔ اس کا اجر بھی دے رہا ہے اور بارگاہ نبوی میں بھی ہمارا درود و سلام پہنچایا جا رہا ہے۔ درود دلوں کو زندگی بخشتا ہے۔ کلام کو خوبصورتی عطا کرتا ہے۔ زندگی میں سرور اور خوشیوں کا سبب بنتا ہے۔ روحانی منازل کے طے کرنے میں آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ (جاری ہے)

CamScanner

زاہد محمود زاہد/ملتان

دل نہیں چاہتا اب آنکھ سے اوجھل دیکھوں
تمہیں دیکھوں تو میں ہر حال مسلسل دیکھوں

جن کی آنکھوں سے فقط خواب رواں ہوتے ہیں
ہم ہیں وہ لوگ جو بچپن میں جواں ہوتے ہیں
ایک ٹوٹی ہوئی دو چار ہیں سالم شاخیں
اپنے گلدان میں اب پھول کہاں ہوتے ہیں
دل کے البم میں ہر اک زخم سجایا ہوا ہے
زخم جیسے بھی ہوں سرمایۂ جاں ہوتے ہیں
شعر سننا بڑا آسان ہے سننے والوں
حال دل کے بڑی مشکل سے بیاں ہوتے ہیں
نامِ پنجتن کبھی لیتے ہوئے چلنا تم بھی
رہ میں آتے ہوئے پتھر بھی دھواں ہوتے ہیں
آپ تو جاتے ہوئے خوش نظر آئے تھے مجھے
آپ کیوں ہجر میں اب گریہ کناں ہوتے ہیں
دیکھنا غور سے ہنستے ہوئے زاہد کو کبھی
جب وہ ہنستا ہے تو آنسو بھی عیاں ہوتے ہیں

یہ تو اپنا ہی فقط سود و زیاں جانتے ہیں
ہم سمجھتے تھے ہمیں لوگ یہاں جانتے ہیں
اپنا معیارِ زر و مال دکھاتے ہوئے لوگ
بکنے والے کی اذیت کو کہاں جانتے ہیں
در و دیوار ترستے ہوں صداؤں کو جہاں
ایسے گھر کو تو پرندے بھی مکاں جانتے ہیں
آپ کیا سمجھیں گے اس دل کی حقیقت کیا ہے
آپ تو عشق کو بھی کارِ زیاں جانتے ہیں
اس لیے سامنے آنے سے گریزاں ہیں عدُو
جانتے ہیں کہ ہم ان کی بھی زباں جانتے ہیں
سب ہیں گلشن کی تباہی میں برابر کے شریک
یہ تو بس نام کے ہیں گریہ کناں جانتے ہیں
بجھنے والا ہے دیا صبح سے پہلے زاہد
چھوڑ جائے گا مقدر میں دھواں جانتے ہیں

وحشتیں ذہن میں لاتے ہوئے رو پڑتے ہیں
پھول بھی شاخ پہ آتے ہوئے رو پڑتے ہیں
پیار کی جنگ کبھی جیت نہیں سکتے وہ
جو کہ میدان میں آتے ہوئے رو پڑتے ہیں
جانے کیوں ضبط ہمیں ٹوٹ کے شرمندہ کرے
رونے والوں کو ہنساتے ہوئے رو پڑتے ہیں
وہ جو اک عمر گنوا کر خوشی ملتی ہے ہمیں
اس کا ہم جشن مناتے ہوئے رو پڑتے ہیں
حال احوال جو دنیا سے چھپاتے پھریں ہم
خود کو اکثر وہ سناتے ہوئے رو پڑتے ہیں
چاند کے ساتھ سبھی رات کو چلنے والے
صبح دم ہاتھ ہلاتے ہوئے رو پڑتے ہیں
عمر آنکھوں کو چھپاتے ہوئے گزرے اُن کی
قرض جو لوگ اٹھاتے ہوئے رو پڑتے ہیں
کیا کریں جان نکلتی نظر آئے زاہد
جانے والے کو بلاتے ہوئے رو پڑتے ہیں

تمہاری آنکھ کی چھاگل میں ڈوب جانے لگی
خدا کا شکر ہماری نظر ٹھکانے لگی
میں خوشیاں بانٹ رہا تھا اداس لوگون مین
خدا کی ذات مرے زخم بھی مٹانے لگی
مرے ہوؤں کو تو دنیا بھلا ہی دیتی ہے
ہمارے ہوتے ہوئے بھی ہمیں بھلانے لگی
تمہارا نام شجر پر لکھا تو خوش ہو کر
ہر ایک شاخ محبت کا گیت گانے لگی
گزرتے وقت کے ہمرہ خلوص جاتا رہا
زباں پہ صرف ضرورت کی بات آنے لگی
ٹہل رہی ہے مرے آس پاس، ملتی نہیں
نگاہِ یار مرا صبر آزمانے لگی
میں جل رہا تھا بڑی خامشی کے ساتھ مگر
تمہارا نام لیا تو ہوا بجھانے لگی
درود پڑھتے ہی منزل کی سمت چلنے لگا
زمین خود ہی مجھے راستہ دکھانے لگی

دل نہیں چاہتا اب آنکھ سے اوجھل دیکھوں
تمہیں دیکھوں تو میں ہر حال مسلسل دیکھوں
جانتا ہوں کہ مرا عشق مکمل ہے اب
چاہتا ہوں کہ ترا عشق مکمل دیکھوں
چاہتا ہوں کبھی دنیا پہ محبت برسے
پیار کے گیت سناتے ہوئے بادل دیکھوں
چاہتا ہوں تمہیں چاہے مرا دل بھی دل سے
چاہنے والے دلوں میں اِسے اوّل دیکھوں
تا کہ ڈوبی ہوئی تصویر ابھر آئے مری
کاش ایسی کبھی اُس آنکھ میں ہلچل دیکھوں
چاہتا ہوں کہیں نفرت کا نشاں تک نہ رہے
پتھروں میں بھی میں اب پھوٹتی کونپل دیکھوں
چاہتا ہوں تو پکارے مجھے بھی میری طرح
پیار میں اپنی طرح تجھ کو بھی پاگل دیکھوں
کل کہ جس آنکھ میں کچھ بھی نہیں تھا میرے لیے
آج اپنے لیے اس آنکھ میں کاجل دیکھوں
اس کے گاؤں کو محبت کی امامت دے دو
کہیں رانجھا کہیں مجنوں کہیں سانول دیکھوں
لے کے جانا ہی پڑے دل کو درِ یار پہ روز
دیکھا جائے نہ تو کیسے اسے بے کل دیکھوں

CamScanner

ڈاکٹر اسد نصیر/کینیڈا

در دل پر ابھی دستک نہ دو کہ خانہ دل میں
ابھی پہلے کرائے دار کا سامان باقی ہے

خیالِ یار کا دل میں جو روشن دان باقی ہے
ہوا اور دھوپ کا گویا ابھی امکان باقی ہے
خرد اب تک دکانِ دل میں حصے دار ہے، سمجھو
محبت میں اگر اندیشۂ نقصان باقی ہے
یقیں مانو وہ جس انداز سے اس بار بچھڑا ہے
مجھے لگتا نہیں کہ وصل کا امکان باقی ہے
یہ میخانہ کوئی مسجد ہے جو مسلک خرید و گے
یہاں پر مے تو بکتی ہے مگر ایمان باقی ہے
میں اپنی عمر تیرے ہجر کو دیکر جو گھر پلٹا
اداسی نے کہا ٹھہرو ابھی تاوان باقی ہے
در دل پر ابھی دستک نہ دو کہ خانۂ دل میں
ابھی پہلے کرائے دار کا سامان باقی ہے
مرے قاتل کو جانے کیوں بہت عجلت تھی جانے کی
میں کہتا ہی رہا اس سے ابھی تو جان باقی ہے

اپنی طرف سے ڈال دے شاید یہ گور کچھ
ورنہ مرے حساب میں نکلے نہ اور کچھ
کیا عشق رائیگانیِ عہدِ شباب تھا
اب عمر کٹ گئی ہے تو کرتے ہیں غور کچھ
ترتیب عمر ہجر نے ایسی بگاڑ دی
پیری میں کٹ گیا ہے جوانی کا دور کچھ
رقصاں تھیں انگلیاں بھی بدن میں لہو کے ساتھ
ڈھیلی سی ہو رہی تھی قبا کی بھی ڈور کچھ
تم چھوڑ ہی گئی تو میں کہتا بھی کیا بجز
''ہونے لگا تھا میں بھی مری جان بور کچھ''
آنسو ہمارے عشق کے ضامن تھے اس لئے
آنکھوں میں رکھ لئے ہیں ضمانت بطور کچھ
شاید یہ ''اور کچھ'' بھی تقاضائے وصل ہو
اس نے تو بارہا یہی پوچھا کہ اور کچھ

جلتے سورج کی تمازت رہی صحراؤں پر
ابرِ بے فیض جو برسا بھی تو دریاؤں پر
شہر پھیلیں تو مضافات سکڑ جاتے ہیں
جانے کیا بیتنے والی ہے مرے گاؤں پر
مثلِ مجنوں مرے ماتھے پہ بھی پتھر سجتا
فاصلہ نقش ہوا الٹا مرے پاؤں پر
میں کوئی مومی مجسمہ ہوں عجائب گھر کا
ابر سے کہہ دو نہ اِترایا کرے چھاؤں پر
اپنے بیمار کو اچھا نہیں ہونے دیتے
یہ بھی تہمت ہے محبت کے مسیحاؤں پر
نہ رکاوٹ ہے نہ پتھر ہیں نہ دلدل کوئی
ایک رحمت ہے پرندوں کی گذرگاہوں پر

دھڑکن میں تری قید ہوں کس طور سے نکلوں
اک اِذن عطا ہو کہ میں اس شور سے نکلوں
جنت سے نکالا گیا دنیا مجھے دے کر
اب دیکھیے کیا ملتا ہے جب گور سے نکلوں
محشر میں مجھے ڈھونڈنے نکلیں جو فرشتے
میں کاش ٹورنٹو نہیں، لاہور سے نکلوں
ہجرت کا کوئی زخم یہ بھرنے نہیں دیتا
تعویذ کوئی دو کہ میں لاہور سے نکلوں
ساحل سے بلاتے ہیں صداؤں کے ہیولے
ڈوبوں تو میں اس منظرِ پُر شور سے نکلوں
یوں تو میں ترے دل میں ہوں پر کس کو خبر ہے
تو ڈھونڈنے نکلے تو کہیں اور سے نکلوں
صدیق کے قدموں کی تو میں خاک نہیں ہوں
پر کاش میں ہمراہِ نبی ثور سے نکلوں

میں کہ پہنچا سرِ افلاک تو حیرت کیسی
سو گیا پھر بھی تہہِ خاک تو حیرت کیسی
عشق کی آگ سرِ طور جلا سکتی ہے
ہو گیا میں بھی اگر راکھ تو حیرت کیسی
پتھروں سے بھی نکل آتے ہیں جھرنے کیا کیا
ہو گئی آنکھ جو نمناک تو حیرت کیسی
عشق کی بخیہ گری آپ نے دیکھی ہے کہاں!
خود بخود سلنے لگے چاک تو حیرت کیسی
چشم کم خواب میں کاجل تھا رضامندی کا
میں اگر ہو گیا بیباک تو حیرت کیسی
ہر سو عیاری خرد کی تھی زبانِ زدِ عام
ہو گیا مجھ کو بھی ادراک تو حیرت کیسی
میں نے بھی سیکھ لیا اپنے غموں پر ہنسنا
میں بھی کچھ ہو گیا چالاک تو حیرت کیسی
اپنے ہی شعر سنے میں نے رقیبوں سے اسدؔ
یعنی کچھ بن ہی گئی ساکھ تو حیرت کیسی

زندگی بھر کے امتحان کے بعد
پھر وہی خُلد اس جہان کے بعد
چاند تاروں سے کیوں مزین ہے
کچھ تو ہے ہفت آسمان کے بعد
نہ کوئی در، نہ حسرتِ دستک
گور اچھی لگی مکان کے بعد
کچھ تو ایمان تھا مرا واعظ
نہ رہا پر ترے بیان کے بعد
دل یوں دھڑکا کہ یادیں جاگ اٹھیں
مقتدی آ گئے اذان کے بعد
وسوسہ، احتمال، شک و شبہ
روگ بڑھتے گئے گمان کے بعد
جو قفس میں ہیں ان کو کیا خطرہ
جال بچھتے ہیں سب اڑان کے بعد
صور پھونکا گیا تو آنکھ کھلی
ایسا سویا میں امتحان کے بعد
گفتگو اصل میں تبھی ہو گی
آنکھ بولے گی کب زبان کے بعد

بھلایا نہ جائے گا

ڈاکٹر علی محمد خاں/لاہور

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

مجھے نہیں معلوم کہ مولانا حالؔی نے یہ شعر کس پس منظر میں کہا تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس شعر کا انطباق میری ذات پر ضرور ہوتا ہے۔ میری بیوی فاخرہ چغتائی کہنے کو تو میری رفیقۂ حیات و شریک زندگی تھیں لیکن اگر آپ تعلّی پر محمول نہ کریں تو عرض کروں کہ وہ میرے نزدیک اس کے علاوہ بھی بہت گراں مایہ تھیں۔ میرے اور اُن کے بیک وقت چھ سات رشتے تھے، وہ میری اہلیہ تھیں، میری بیٹی کی ماں تھیں، میری دوست اور غم گسار تھیں، میری محبوبہ تھیں، میری سیکرٹری تھیں، میرے گھر ''کنج عافیت'' کی منتظم و منصرمِ اعلیٰ تھیں اور سیر و سیاحت میں ہمیشہ میری شریکِ سفر رہیں۔ انہوں نے میرا کم و بیش چون سال تک ساتھ نبھایا لیکن پھر نجانے ان کے جی میں کیا آئی کہ سالِ رواں ۱۳ ستمبر کو عین غروبِ آفتاب کے وقت علامہ اقبالؔ کے الفاظ میں دنیائے فانی کو الوداع کہنے اور عالمِ جاودانی کے لیے رُخصت ہو جانے ہی میں عافیت سمجھی:

رُخصت اے بزمِ جہاں! سوئے وطن جاتا ہوں میں
چھوڑ کر مانند بو، تیرا چمن جاتا ہوں میں

فاخرہ کو میرے ساتھ جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ کہا کرتی تھیں ''میں نے اپنی ساری زندگی آپ کے لیے وقف کر دی ہے۔'' میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ سب جذباتی باتیں نہ تھیں بلکہ واقعی ایسا ہی تھا۔ وہ تہجد گزار اور نماز پنج گانہ پر سختی سے کار بند تھیں اور گزشتہ کئی سالوں سے تو ان کا یہ حال تھا کہ رات کو سوتے میں اچانک اُٹھتیں اور میرے ہاتھوں اور پاؤں کو چومنے لگ جاتیں۔ اگر میں حیص بیص سے کام لیتا تو کہتیں خدارا آپ مجھے کسی بات سے منع نہ کریں۔ یہی میری خوشی ہے۔ دریں حالیکہ مرزا غالبؔ کے الفاظ میں میں تو یہ کہتا ہوں:

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ایک محتاط اندازے کے مطابق تادمِ تحریر میرے ایسے ان گنت عزیز شاگرد ہیں جو کلیدی عہدوں پر فائز اور متمکن ہیں۔ میں ان کے نام بوجوہ نہیں لے سکتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ میرے تمام شاگردوں اور دوستوں کی چائے وائے کا انہوں نے ہمیشہ اس قدر خیال رکھا کہ وہ انہیں اپنی والدہ اور ''کنج عافیت'' کو اپنے گھر کا درجہ دینے لگ جاتے۔ پھر انہیں زندگی میں کامیابی و کامرانی کی دُعائیں دینا اس پر ہمیشہ مستزاد رہا۔

اس موقع پر میں اپنی ہونہار بیٹی ڈاکٹر فرح علی کا جن میں کافی حد تک اپنی ماں کی خو بو رچی بسی ہے۔ ذکر ضرور کروں گا۔ ڈاکٹر فرح علی ان کی علالت کے ڈیڑھ سال کے عرصے میں سڈنی (آسٹریلیا) سے اپنے بھرے پرے گھر اور معروف و مصروف کلینک کو چھوڑ کر پانچ بار اپنی امی کی تیمارداری اور نگہداشت کے لیے لاہور آئیں۔ آخری مرتبہ وہ ۱۹ تا ۲۹ اگست ۲۰۲۴ء کو آئیں اور انہیں بھلی چنگی کر کے واپس گئیں۔ پھر جب دیکھا کہ علالت میں اشتداد ہے تو ہسپتال کے متعلقہ ڈاکٹروں سے رابطہ رکھا اور پندرہ دن کے بعد ہی ۱۳ ستمبر ۲۰۲۴ء کو پھر آ گئیں۔ شاید ڈاکٹر ہونے کے ناتے انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ان کی امی کے دنیا سے کوچ کی تیاری ہے مگر ان کے انتقال کے چھ گھنٹے کے بعد لاہور پہنچیں۔

اس موقع پر میں اپنے قارئین کو سوگوار نہیں کرنا چاہتا لیکن کچھ اپنے ایسے اعزہ و اقربا کے نام ضرور لوں گا جنہوں نے فاخرہ کی خدمت کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا تھا۔ ان میں میری بیٹی سے بھی زیادہ پیاری بیٹی فرزانہ علی متقی، عجوہ عامر خاں جو تین دن پہلے برطانیہ سے بطورِ خاص اُن کی تیمارداری کے لیے آئی تھیں اور میرا بھتیجا وحید الزماں ساجد، جو میرا بھتیجا کم اور بیٹا زیادہ ہے، ریاض (سعودی عرب) سے آیا تھا، بیٹی صدف طاہر، بھابھی شمیم نصر اللہ خاں، پیاری بیٹی نجم الصباح اور میری چھوٹی ہمشیرہ نعیمہ رمضان اور برادرِ خرد نصر اللہ خاں کے نام شامل ہیں۔ اگر یہ لوگ مجھے اس ضعف پیری اور بڑے دکھ کی گھڑی میں سہارا نہ دیتے اور میرا اعصائے پیری نہ بنتے تو میں یقینی طور پر لڑکھڑا جاتا۔ رہے نام اللہ کا۔ اس دنیا سے رُخصت تو سب کو ہونا ہے۔ فاخرہ نے بھی سفرِ آخرت اختیار کیا تو کچھ عجب نہیں لیکن سفر سفر کرنے میں فرق ہے۔ میں تو ان کا شریک زندگانی تھا ہی، میرا خیال ہے کہ ان کی دنیا سے رُخصتی کا یہ حال میرے تمام اقرباء کو بھی تا دیر نہیں بھولے گا۔ اس موقع پر مجھے علامہ اقبال کا وہ شعر یاد آ رہا ہے جو انہوں نے اپنی والدہ ماجدہ کے انتقال پر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر

فاخرہ کے سفرِ آخرت کا بھی یہی حال تھا۔ جیسی اشک بار آنکھوں سے لوگوں نے انہیں الوداع کہا اس کیفیت کو میرے لواحقین شاید کبھی فراموش نہ کر سکیں۔ اس موقع پر اپنے قارئین کے لیے ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کے وہ الفاظ ضابطہ تحریر میں لاتا ہوں جو انہوں نے فیس بک پر درج کر کے اپنے سیکڑوں، ہزاروں احباب تک پہنچائے۔ انہوں نے لکھا:

CS CamScanner

”دوستو! آج اس خاتون کا جنازہ پڑھ کے آیا ہوں، گزشتہ سترہ سال سے جن کا گھر لاہور میں میرا دوسرا گھر تھا۔ ڈاکٹر علی محمد خاں کے ساتھ ازدواجی زندگی کے کامیاب چون سال گزارے۔ اگر کہا جائے کہ ڈاکٹر صاحب کی کامیابیوں میں ڈاکٹر صاحب سے زیادہ ہاتھ انہی خاتون کا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ، دوست، محبوبہ، مینیجر، سیکرٹری، گھر بھر کی کیئرٹیکر اور ہر کام میں ان کی معاون تھیں۔ انہوں نے نصف صدی سے زائد عرصے تک ڈاکٹر صاحب کو کھانے پینے، اوڑھنے، پہننے، سلوانے، سودا سلف منگوانے اور مہمان نوازی جیسے خرخشوں سے آزاد رکھا۔ شاعر نے ایسے ہی لوگوں کی بابت کہا تھا:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

انہوں نے ہمیشہ ڈاکٹر صاحب سے بڑھ کر مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح اور میرے تمام بچوں حتیٰ کہ میرے اعزہ کو بھی اپنا قریبی عزیز ہی سمجھا۔ ہماری ہر خوشی غمی میں ہم سے بڑھ کے شریک رہیں۔ ہر بچے کا ہمیشہ نام لے کے حال پوچھا۔ ہر معاملے میں ہمیشہ اچھے مشوروں سے نوازا۔ مہمانوں کو اصرار کر کے بلانے، اچھے سے اچھا کھلانے پلانے اور تحفے تحائف دینے میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ ان کی مغفرت اور بلندیٔ درجات کے لیے بہت ساری دُعائیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں (فاخرہ چغتائی، مسز ڈاکٹر علی محمد خاں، عبدالرحمٰن چغتائی کی عزیزہ) اپنے جوارِ رحمت میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے! آمین۔“

ہر چند اس بات کو ایک زمانہ بیت گیا ہے لیکن مجھے آج بھی پینتالیس چھیالیس سال پہلے کا وہ زمانہ یاد ہے جب فاخرہ نے مجھے علامہ اقبال ٹاؤن میں اپنا فلیٹ ”کنج عافیت“ خریدنے کا مشورہ دیا اور اس سلسلے میں اپنا کچھ زیور بھی فروخت کر دیا اور ایک سال سے زیادہ عرصے تک قرض کی قسطیں ادا کیں اور پھر یہ فلیٹ انہیں اتنا عزیز ہوا کہ اسے سجانے سنوارنے میں اپنی عمر بھر کی نقدی صرف کر دی اور ان کا جنازہ بھی یہیں سے اُٹھایا۔ دنیا سے رُخصت ہونے سے تقریباً دو ماہ پہلے انہیں نا معلوم کیا سوجھی کہ ماں جی کی یادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک چھوٹا سا خوب صورت چرخہ خرید لائیں کیوں کہ ماں جی چرخہ چلایا کرتی تھیں اور اس دن ہم تا دیر ماں جی کی سادہ لوحی کی باتیں کرتے رہے اور اس کے ہفتہ عشرہ بعد خالص پیتل کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا ہینڈ پمپ خرید لائیں، جس کے بارے میں انہوں نے مجھی سے سنا تھا کہ میرا سارا بچپنا گاؤں میں ہینڈ پمپ چلانے اور گھڑونجی پر رکھے پانی کے گھڑے بھرنے میں گزرا تھا۔ بھلا میں ان کی ان یادوں کو کیسے بھلا سکتا ہوں۔

۱۴ ستمبر ۲۰۲۴ء کو ہمارے گھر ”کنج عافیت“ میں رنج والم کا جو سماں تھا، اس کیفیت کو بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ کسی نے بجا کہا ہے کہ ”ہم سائے، ماں جائے“ یعنی عزیز و اقارب تو بعد میں آتے ہیں اور ہم سائے ڈھارس بندھانے کو پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ میں اپنے ہم سایوں میں سے بالخصوص جمال عزیز صاحب، سید نجیب الحسن صاحب، زاہد صاحب اور قاری سیف الملوک کا تازیست ممنون رہوں گا جو اس مصیبت کی گھڑی میں میرے ملجا و ماویٰ بنے اور تجہیز و تکفین کے سارے انتظام و انصرام میں پیش پیش رہے۔ اس حوالے سے مجھ پر واجب ہے کہ میں اپنے ان گنت شاگردانِ عزیز میں سے تین شاگردوں کا ذکرِ خیر ضرور کروں۔ ان میں سے ایک ڈی سی شیخوپورہ شاہد عمران مارتھ، دوسرے ڈی سی گجرات صفدر حسین ورک اور تیسرے ڈائریکٹر ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن فیصل سندھو ہیں۔ جب میں نے انہیں کہا کہ میرے ہم سائے سارا انتظام بخوبی کر لیں گے تو یہ تینوں روہانسا ہو گئے اور کہنے لگے کہ آپ کی رفیقہ حیات ہماری ماں تھیں۔ آپ ہمیں اس کارِ خیر سے منع نہ کریں اور میں چپ کا چپ رہ گیا اور انہیں سوائے دُعائیں دینے کے اپنی زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔

فاخرہ کا جنازہ دو جگہوں پر پڑھا گیا۔ ”کنج عافیت“ سے ملحقہ ڈونگی گراؤنڈ میں بروز ہفتہ (سنیچر) صبح ساڑھے دس بجے اور دوسرا وزیرآباد اور ڈسکہ کے تقریباً وسط میں میرے آبائی گاؤں متراں والی۔ لاہور میں جو نمازِ جنازہ ہوئی اس میں میرے عزیز و اقارب اور دوست احباب کی خاصی تعداد تھی۔ یہ نمازِ جنازہ میری خواہش پر قاری سیف الملوک نے پڑھائی، جن سے فاخرہ نے قرآن مجید پڑھا تھا اور چار بار دہرائی کی تھی اور آج کل انہیں قرآن مجید کی وہ سورتیں سنا رہی تھیں جو انہوں نے اپنی علالت کے دوران ازبر کی تھیں۔ متراں والی میں فاخرہ کا جنازہ جس اعزاز سے پڑھا گیا ویسا جنازہ گاؤں کے لوگوں نے شاید اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ نمازِ جنازہ ”مدرسہ عربیہ تعلیم القرآن متراں والی“ کے سابقہ مہتمم اعلیٰ مولانا یوسف میواتی، جن کے ساتھ میری پرانی یاد اللہ تھی، کے بڑے صاحبزادے اور حالیہ مہتمم اعلیٰ مولانا طارق جمیل میواتی نے پڑھائی۔ نماز جنازہ سے قبل مولانا نے اپنے مخصوص اندازِ تکلم میں حیات و موت کا جو فلسفہ بیان کیا وہ بڑا دل پذیر تھا۔ سامعین اور قارئین کی معلومات کے لیے عرض ہے کہ متراں والی کے مدرسہ ہذا میں تادمِ تحریر تقریباً ڈھائی سو بچے اور بچیاں تعلیم پا رہے ہیں اور مدرسے کے نظم و نسق اور تعلیم کا چرچا سن کر پنجاب بلکہ پاکستان بھر کے مختلف اضلاع اور بیرونِ ملک سے بھی بچے تعلیم القرآن حاصل کرنے کے لیے کشاں کشاں آتے ہیں جن میں سے نصف تعداد سے زیادہ بچے مدرسہ ہی میں طعام و قیام کرتے ہیں۔

فاخرہ کو شہرِ خموشاں میں میری والدہ ماجدہ کی لحد سے بالکل متصل جگہ ملی۔ شاید اس کی بڑی وجہ قدرت کی طرف سے یہ رہی تھی کہ وہ میری ماں کی بڑی لاڈلی بہو تھیں۔ جب ہم سب ایک جگہ پونچھ ہاؤس کالونی،

CS CamScanner

ملتان روڈ لاہور یا علامہ اقبال روڈ، لاہور پر رہتے تھے تو میرا خیال ہے فاخرہ نے جتنی میری والدہ کی خدمت کی تھی اور جتنی اُن سے دُعائیں لی تھیں، وہ انہی کا حصہ ہے۔ میری والدہ نے ۲۷ نومبر ۱۹۸۹ء کو انتقال کیا تو انہوں نے آخری سانسیں بھی فاخرہ کی گود ہی میں لی تھیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اگر کسی دیورانی جٹھانی میں سے کسی نے فاخرہ کو سخت سست کہا تو میری ماں اس کے ساتھ لڑنے بھڑنے کو تیار ہو جاتی تھیں۔ احمد مشتاق نے کیا خوب صورت بات کہی ہے:

ایک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے
اور اب کوئی کہیں، کوئی کہیں رہتا ہے

معاشرے میں دیورانی جٹھانی کی چپقلش کے طرح طرح کے قصے سننے کو ملتے ہیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ فاخرہ نے اپنی دیورانی شمیم نصر اللہ خاں کی وقتِ ضرورت دو دفعہ خون کا عطیہ دیا جس کا اثر یہ ہوا کہ دیورانی کی رگوں میں بھی جٹھانی کا خون دوڑنے لگا اور ان میں اُلفت دو چند ہو گئی۔

ہمارے دونوں خاندان کے سبھی لوگ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فاخرہ کی ذات ہی تھی جس نے دونوں خاندانوں کے سبھی افراد کو ایک مٹھی کی مانند جوڑ کے رکھا ہوا تھا۔ مدت العمر فاخرہ کا یہ دستور رہا کہ اپنے گھر میں ہر ہفتے عشرے کے بعد کسی نہ کسی گھرانے کے تمام افراد کو ظہرانے یا عشائیے پر ضرور مدعو کرتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ کسی کو بھوکا نہیں رکھتا بس یہ مل بیٹھنے کا بہانہ ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اب فاخرہ تو رہی نہیں اور ان کی بیٹی دور پردیس آسٹریلیا میں جا بسی ہے۔ ان کی یہ رسم دیرینہ کون نبھائے گا۔ میں دیکھتا ہوں کہ ان جیسا دم خم کسی میں نہیں۔

جب ہم فاخرہ کو سپردِ خاک کر رہے تھے تو میں دیکھ رہا تھا کہ میرا سگا بھتیجا وحید الزماں ساجد جو مجھے بیٹوں سے بڑھ کر عزیز ہے اور جس کے آئینے میں مجھے اپنا بچپن کا عکس دکھائی دیتا ہے اور جو فاخرہ ہی کے ہاتھوں میں پلا بڑھا تھا، فاخرہ کو لحد میں اُتارنے میں پیش پیش تھا۔ عین اس لمحے میری آنکھوں کے سامنے اس کا وہ زمانہ آ گیا جب وہ فاخرہ کی گود میں کھیلا کرتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ یہ فاخرہ ہی کو کریڈٹ جاتا ہے کہ اس نے میرے سگے بھانجے اسلم خاں کو جو پی ایم ایس آفیسر کے طور پر ریٹائر ہو کر وظیفہ حسن خدمت (پنشن) پا رہے ہیں اور بڑے بھائی جمال محمد خاں کے دونوں بیٹوں عزیزم ظہیر اللہ خاں، جو سکول ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ سے ۲۰۱۸ء میں بطورِ سینئر سائنس ٹیچر ریٹائر ہوئے اور عزیزم منیر اللہ خاں جو ۲۰۲۵ء میں بطورِ سینئر ہیڈ ماسٹر ریٹائر ہوں گے، کی تعلیم و تربیت اور روشن مستقبل فاخرہ کا رہینِ منت ہے۔

جب ہم ۱۴ ستمبر ۲۰۲۴ء کو مرحومہ کی تدفین کے تمام مراحل طے کر کے لوگوں کے جلو میں شہرِ خموشاں سے افسردہ افسردہ گھر کی طرف لوٹ رہے تھے تو ایک گرم و سرد زمانہ چشیدہ ضعیف العمر شخص مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے:

”میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے مذہبی معاملات سے کچھ سروکار ہے مگر اتنا جانتا ہوں کہ ہماری یہ بہن جس کی ہم تدفین کر کے آ رہے ہیں اگر جنت میں نہ گئی تو پھر جنت ہے ہی نہیں اور یہ صرف مولویوں کا ڈھکوسلا ہے۔“

اور میں سوچ میں پڑ گیا کہ وہ کون سی بات تھی جو اس کے دل کو اچھی لگی اور جس نے اسے مرحومہ کے بارے میں یہ سب کچھ کہنے پر مجبور کیا اور اس موقع پر میرے ذہن میں معاً فاخرہ کا وہ وتیرہ یاد آ گیا جب وہ درپردہ ایسی ضعیف عورتوں، بیواؤں یا مفلوک الحال لوگوں کی کفالت کرتی تھیں، جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا اور ان کی ہنستے مسکراتے ایسے مدد کرتی تھیں کہ ان کی مدد بھی ہو جائے اور عزتِ نفس بھی مجروح نہ ہو اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ عمر رسیدہ بزرگ کے کان میں مرحومہ کے اس وتیرے کی بھنک پڑ گئی ہو گی۔

خیر فاخرہ کی تدفین کے بعد ہم اپنے گاؤں والے گھر میں آ گئے اور میں تھوڑی دیر کے لیے نڈھال کیفیت میں آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ گیا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ نفس نے اپنے تمام مطالبات چھوڑ دیے ہیں۔ فاخرہ کا سارا زمانہ ماضی میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ اچانک مجھے ۱۹۷۱ء کا وہ زمانہ یاد آ گیا جب ہماری شادی کو فقط چند ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ ہم پہلی بار عید الفطر منانے کے لیے اپنے گاؤں گئے۔ اس دن عید کا چاند نظر نہ آیا اور ریڈیو پر اعلان ہو گیا کہ عید کل کے بجائے پرسوں ہو گی تو ہم نے سوچا کہ ایک دن اور سیر سپاٹا کر لیتے ہیں اور ہیڈ مرالہ چلتے ہیں کیوں کہ اس کے نواحی قصبے کوٹلی لوہاراں مغربی میں میں نے اپنی جوانی کے چار سال بسر کیے تھے اور میں نے وہاں جنون کی حد تک شکار کھیلا تھا اور مجھے اس علاقے سے لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ ہمارے پاس ہونڈا 90 تھا۔ ہم ہیڈ مرالہ کی سیر کرنے کے بعد براستہ کوٹلی لوہاراں اور کھروٹا سیداں کوٹلی بہرام (سیالکوٹ) پہنچے تو اچانک ہماری موٹر بائیک خراب ہو گئی۔ اُس زمانے میں وہاں موٹر مکینک کی ایک ہی دکان تھی۔ مکینک نے کہا کہ آج تو موٹر بائیک کسی صورت میں ٹھیک نہ ہو سکے گی اور اب عید کے بعد ہی دکانیں کھلیں گی تو بات بنے گی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ہم نے موٹر بائیکل مکینک کی دکان ہی پر چھوڑی اور بذریعہ بس ڈسکہ آ گئے۔ وہاں ایک بائیسکل کرایہ پر لی جس پر سوار ہو کر رعیہ برانچ نہر (موجودہ نام بی آر بی) کے کنارے کنارے گاؤں کا رُخ کیا۔ ہمیں گاؤں جلد پہنچنا تھا کیوں کہ یقین تھا کہ باپو جی ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ فاخرہ بائیسکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ راستہ کچا تھا، سانپوں کا بھی ڈر تھا اور نہر پانی سے لبالب بھری تھی۔ مجھ سے بائیسکل تیز نہ چل رہی تھی۔ فاخرہ کہنے لگی کہ آپ بائیسکل مجھے دیں، مَیں تیز چلاؤں گی۔

CS CamScanner

میں نے بائیسکل اُسے دی تو واقعی اُس نے بائیسکل مجھ سے کہیں زیادہ تیز چلائی۔ میں نے کہا کہ بائیسکل ذرا آہستہ چلائیں یوں نہ ہو کہ ہم نہر میں جا گریں اور ہمارا نام ونشان بھی نہ ملے۔ کہنے لگیں کہ آپ چاہیں تو ایک بندہ پیچھے اور بٹھا لیں لیکن میں بائیسکل اس سے آہستہ نہیں چلا سکتی۔ خیر ہم آدھ پون گھنٹے کے بعد گھر پہنچ گئے تو سکھ کا سانس لیا اور باپو جی جو ہماری راہ دیکھ رہے تھے، کی فکر دور ہو گئی۔

مذکورہ واقعہ سنانے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا چون سال کا یہ دور یوں ہنستے مسکراتے بسر ہو گیا کہ وقت گزرنے کا پتا بھی نہ چلا اور فاخرہ راہی ملک عدم بھی ہو گئیں۔ فاخرہ کے بارے میں کہاں تک لکھوں۔ بقول میرؔ:

سرو کار آہ کب تک خامہ و کاغذ سے یوں رکھئے
رکھے ہے انتہا احوال کی تحریر بھی آخر

تمام باتیں لکھنے بیٹھوں گا تو کاغذ کے دستے کے دستے ختم ہو جائیں گے مگر باتیں ختم نہ ہوں گی۔ ہر چند فاخرہ کی طبیعت ایک ڈیڑھ سال سے بحال نہیں تھی مگر نامعلوم کیوں میرے وہم وگمان میں یہ نہیں تھا کہ وہ واقعی ہمیں سوگوار کر کے اتنی عجلت میں رُخصت ہو جائیں گی۔ حالاں کہ سب کو معلوم ہے کہ جلد یا بدیر سب کو دنیائے فانی سے رُخصت تو بہر کیف ہونا ہی ہے لیکن سوچتا ہوں کہ میں انہیں کیسے بھلا پاؤں گا۔ کیوں کہ وہ میرے لیے اتنی ناگزیر تھیں کہ میرے پاس وہ الفاظ نہیں جن میں اپنے جذبات کا اظہار کر سکوں۔

ساری دنیا مہنگائی کرتی ہے اور لوگ شب و روز یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ انڈے بہت مہنگے ہو گئے ہیں۔ مرغی کے گوشت کی قیمتوں کو پر لگ گئے ہیں۔ مٹن کی قیمت لوگوں کی دسترس سے باہر ہوتی جاتی ہے۔ بعض لوگوں کو بیف بھی مشکل سے میسر آتا ہے۔ متوسط طبقے کے لوگ اور غریب غربا سبزیوں اور دالوں پر گزر بسر کر لیا کرتے تھے۔ اب یہ چیزیں بھی اُن کے لیے عنقا ہوتی جا رہی ہیں اور عزت و آبرو کے ساتھ تن ڈھانپنا اور اس پاپی پیٹ کا بھرنا دشوار ہو گیا ہے، مگر میں نے اس بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا، کیوں کہ انہوں نے گھر گرہستی کے سارے بکھیڑے اپنے ذمے لے رکھے تھے اور مجھے ان خرخشوں اور جھمیلوں سے ہمیشہ لاتعلق اور بے فکر کیے رکھا تھا تا کہ مجھے سیر و سیاحت کے بعد جتنا بھی وقت میسر آئے، اُسے پڑھنے لکھنے میں صرف کروں۔ ''سیر و سیاحت'' کے حوالے سے مجھے یاد آیا کہ فاخرہ ہمیشہ میری شریک سفر رہیں۔ قارئین یہ جان کر حیران ہوں گے کہ ہم دونوں سات مرتبہ آسٹریلیا اور سات ہی مرتبہ برطانیہ کی سیر و سیاحت اور چار بار بسلسلہ حج وعمرہ و زیارات سعودی عرب جا چکے ہیں۔ ایک دفعہ پھر آسٹریلیا یا برطانیہ جانے کے لیے پر تول رہے تھے مگر وہ جو کہتے ہیں کہ تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ، یہ آرزو بر نہ آئی۔ مزید برآں دونوں نے ایک دوسرے کی ہم راہی میں پاکستان کا چپہ چپہ دیکھ رکھا ہے۔ وادیِ سون سکیسر جس کا راستہ اتنا دشوار گزار ہے کہ الامان والحفیظ، لیکن ہم نے اس وادی کی سیر و سیاحت دو دفعہ کی ہے اور شنیدہ کے بود مانند دیدہ کے مصداق ایک بار ہم دونوں کے لیے ڈسٹرکٹ کونسل کے ''پھلواڑی'' گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے اور ایک بار کلاہِ کوہ پر پاکستان فضائیہ کا ایک ریسٹ ہاؤس ہمارا مستقر بنا۔ جنگلی زعفران کے ہزاروں لاکھوں پودے، کیکر کی مانند کالی مرچوں کے درخت، جاپانی پھل سے لدے پھندے درخت، الائچی، دار چینی اور لونگ کے پودے ہم نے وادیِ سون سکیسر ہی میں دیکھے۔ جنہیں پہلی بار دیکھ کر ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ''پھلواڑی'' گیسٹ ہاؤس میں قیام کے دوران میں مقامی منتظمین کی طرف سے ہمیں تاکید تھی کہ ہم غروبِ آفتاب کے بعد گیسٹ ہاؤس سے باہر نہ نکلیں مبادا ہمیں جنگلی سور نقصان پہنچائیں۔ اس ضمن میں یہ بات بھی واجب التحریر ہے کہ وادیِ سون سکیسر کی سیر کے دوران ایک دن ہم نے اُچھالی جھیل کی بھی سیاحت کی۔ میں قارئین کے علم میں اضافہ کرتا چلوں کہ اس پرفضا وادی کی یہ جھیل دنیا بھر میں اپنی نوعیت کی ایک منفرد مثال ہے اور اُچھالی جھیل جو کم و بیش انیس بیس کلومیٹر طویل اور نو دس کلومیٹر عریض ہے، دراصل بھاری پانی کی جھیل ہے اور چوں کہ بندہ اس میں ڈوبتا نہیں بلکہ یہ اُچھال دیتی ہے، اس لیے اس کا نام ''اچھالی جھیل'' اور نزدیکی گاؤں کا نام اسی جھیل کی نسبت سے ''اچھالی'' ہے۔ کسی زمانے میں سردیوں میں روس اور سائبیریا وغیرہ کی طرف سے آنے والے آبی پرندے جب جنوب کا رُخ کرنے تو جھنڈ کے جھنڈ اس جھیل میں بسیرا کرتے تھے۔ شاید یہ ٹھکانہ انہیں بے حد پسند تھا لیکن بڑی حیرت اور بڑے افسوس کی بات ہے کہ کچھ ظالم شکاریوں نے ان کم یاب آبی پرندوں کو بندوقوں سے فائر کر کر کے اس قدر خوف زدہ کر دیا ہے کہ وہ یہاں آتے ہوئے گھبراتے ہیں اور اپنا رُخ اکثر و بیشتر کسی اور جانب کر لیتے ہیں۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ وادیِ سون کی ہم نے دو بار سیاحت کی اور وہاں گھنے جنگل میں ہم نے ایسے ایسے نایاب اور خوب صورت پرندے دیکھے کہ باید و شاید۔ ہماری اس سیاحت کا انتظام میرے ایک شاگردِ رشید عبداللہ خرم نیازی نے کیا تھا جو اُس زمانے میں خوشاب میں اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے تعینات تھے اور آج کل پنجاب میں کسی ضلع کے ڈپٹی کمشنر ہیں۔ میں اس التفات پر ان کا ہمیشہ حد درجہ شکر گزار ہوں گا۔

اسی طرح ہم نے کئی بار کراچی، سکھر، ملتان، ڈیرہ غازی خان، فورٹ منرو، تونسہ بیراج، قصبہ گجرات (مظفر گڑھ)، چنیوٹ، وادیِ سوات میں بحرین، کالام، اتروڑ، پشاور، لنڈی کوتل، وارسک ڈیم، باڑہ، خوازہ خیلہ، مالم جبہ، جھیل سیف الملوک، بابوسر ٹاپ، تربیلا ڈیم، غازی گھاٹ، منگلا ڈیم، قلعہ روہتاس،

خان پور ڈیم، بھکر، منکیرہ، صوابی، اٹک وادی نیلم میں میرپور، مظفر آباد، کالا باغ ڈیم، بوہڑ بنگلا (کالا باغ)، راول ڈیم، اسلام آباد، دامن کوہ، شکر پڑیاں، مارگلا ہلز، پیر سہادا، گھوڑا گلی، مری، نتھیا گلی، خانس پور، ٹھنڈیانی، ایبٹ آباد، نمل ڈیم، سملی ڈیم، کٹاس مندر، کلر کہار، چوآ سیدن شاہ، کھیوڑہ، کھائی ڈیم (چکوال)، ہرن مینار، جنڈیالہ شیر خان، مغل گارڈنز (واہ)، پنجہ صاحب (حسن ابدال)، ٹیکسلا اور ایسی ایسی جگہوں کی سیاحت کی جنہیں دیکھنا تو درکنار شاید اُن کے نام بھی لوگوں نے کم ہی سنے ہوں گے۔ ٹیکسلا کے نام سے مجھے یاد آیا کہ ٹیکسلا میں ہر بار ہمارا قیام ٹیکسلا میوزیم کے نواح میں محکمہ آثارِ قدیمہ کے زیرِ انصرام اس ریسٹ ہاؤس میں ہوتا رہا جہاں کسی زمانے میں ماہر آثارِ قدیمہ سرجان مارشل (۱۸۷۶ء، ۱۹۵۸ء) کی رہائش تھی۔ ان کی ایک قدِ آدم تصویر ٹیکسلا میوزیم کے داخلی دروازے کی متصل دیوار پر آویزاں ہے اور ان کی رہائش کو آج کل ریسٹ ہاؤس کا درجہ دے دیا گیا ہے۔

مجھے یاد آیا کہ ایک دن میں نے چشمِ تصور سے سر جان مارشل کو دیکھا اور ان سے دریافت کیا ”سر جان مارشل! پاکستان کی سرزمین دنیا بھر کی قدیم ترین تہذیبوں کا مرکز رہی ہے مگر آپ صرف بیس فی صد حصہ دریافت کر سکے اور ہڑپہ کے اسی فی صد ٹیلے ویسے کے ویسے پڑے کسی ماہر آثارِ قدیمہ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ آپ کے بعد ویسا ماہر آثارِ قدیمہ پاکستان کو کیوں میسر نہیں آیا اور آج تک پاکستان میں سیاحت کو انڈسٹری کا درجہ کیوں نہیں مل سکا؟“ تو انہوں نے میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیا اور زہر خند رویے کے ساتھ اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ مطلب یہ کہ ہم نے ہمیشہ بہ اسفار کو وِندا کی خبر لاتے اور وقت خواہ سر کرتے ہوئے ایک دوسرے کی ہم راہی میں طے کیے تھے۔

مع ہذا اس موقع پر میں فاخرہ کی ایک قریبی دوست مسز شازیہ ظفر راجا، جو دمِ تحریر ایڈیشنل سیشن جج (بہاول پور) کے عہدے پر فائز ہیں، کی تحریر ضرور شامل کروں گا، جنہوں نے فاخرہ کی رحلت کے تقریباً ایک ماہ بعد ان سے متعلق اپنے جذبات و احساسات کا اظہار بڑے وقیع انداز میں کیا ہے جس کے لیے میں ان کا انتہائی ممنون ہوں۔ وہ لکھتی ہیں:

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

ہر چند علامہ اقبال نے یہ شعر اپنی والدہ مرحومہ کو مخاطب کر کے کہا تھا مگر میں سمجھتی ہوں کہ اس شعر کے مفہوم کا اطلاق میری میری ہمدمِ دیرینہ فاخرہ چغتائی مرحومہ، جو ۱۳ ستمبر کو عالمِ جاودانی کو سدھار گئیں اور آج انہیں ہم سے رُخصت ہوئے ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے، کی ذات پر بھی ضرور ہوتا ہے۔

موت ایک ایسی ازلی و ابدی اور اٹل حقیقت ہے، جس سے کسی ذی روح کو مفر نہیں۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت کے مصداق ہر انسان پیدا ہی مرنے کے لیے ہوتا ہے اور اس دارِ فانی میں ہر آنے والے کو بالآخر اپنے ربِ کریم کی جانب لوٹ کر جانا ہے۔ مگر ہمارے اردگرد کچھ ایسے مہربان چہرے ہوتے ہیں جن کی موجودگی ہمارے لیے باعث راحت ہوتی ہے اور ان کی ہمیشہ ہمیشہ کی جدائی دل کو گہرا صدمہ پہنچاتی ہے۔

گہری آنکھیں، روشن چہرہ اور ہمہ وقت لبوں پر نرم مسکراہٹ سجائے فاخرہ چغتائی جن کو میں فاخرہ بھابھی کہا کرتی تھی، ایسی ہی شاندار شخصیت تھیں جو ایک ماہ سے کچھ عرصہ زیادہ قبل ہمیں داغِ مفارقت دے گئیں۔ ان کا معتبر حوالہ نامور دانش ور، محقق، ادیب اور نقاد ڈاکٹر علی محمد خاں کی شریکِ حیات ہونے کا تو تھا ہی مگر وہ خود بھی اپنی ذات میں اک انجمن تھیں۔ جہاں ڈاکٹر صاحب کی تحریریں زبان و بیان کی نفاست اور ادبی محاسن سے بھرپور ہیں، وہیں فاخرہ بھابھی کی شخصیت بھی شائستگی، نرم خوئی، ملنساری اور خوش گفتاری کی آئینہ دار تھی۔ اعلیٰ اخلاق، وضع داری اور مہمان نوازی ہمیشہ سے اس خوبصورت جوڑے کا طرۂ امتیاز رہا۔ ان کا چہرہ ہمیشہ محبت بھری مسکراہٹ سے مزین رہتا جو نہ صرف انہیں محفل میں دوسروں سے ممتاز کرتا بلکہ اردگرد موجود ہر شخص کو خوشی سے ہم کنار بھی کرتا۔

میری زندگی کی بہت سی حسین یادیں سرخ اینٹوں سے تعمیر شدہ، بوگن ویلیا (Bougainvillea) اور کریپر (Creeper) کی بیلوں سے ڈھکے اس خوب صورت گھر سے وابستہ ہیں جسے آپ دونوں نے ”کنج عافیت“ کا نام دے رکھا ہے اور اس ”کنج عافیت“ میں ہمیشہ عافیت ہی عافیت اور خیر ہی خیر رہی۔ جہاں آپ دونوں کھلے دروازے اور وسیع دل کے ساتھ ہر بار ہمارا بھرپور استقبال کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ لاہور میں میرا قیام جتنا بھی مختصر ہوتا وقت کے خزانے سے کچھ لمحات آپ کی صحبت میں بتانے کے لیے میسر آ ہی جاتے۔ چوں کہ دل کی طرح دسترخوان بھی وسیع تھا لہٰذا ہر بار بصد اصرار کھانے کا اہتمام کرتیں۔

بلاشبہ فاخرہ بھابھی کی شاندار شخصیت کا ہر ہر پہلو الگ کتاب کا متقاضی ہے اور چند صفحات میں ان کی خوبیوں کا احاطہ ممکن نہیں۔ میں اللہ پاک سے دعا گو ہوں کہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ روزِ محشر اپنے محبوب کے صدقے ان کو جنت میں اعلیٰ و ارفع مقام اور تمام اہل خانہ و عزیز و اقارب کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ (آمین)“

اس موقع پر مجھ پر لازم آتا ہے کہ میں اپنے ان تمام احباب کا شکریہ ادا کروں جنہوں نے اس غم و الم کی گھڑی میں میری ڈھارس بندھائی اور مجھے صبرِ جمیل کی تلقین کی۔ باری تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے اور فاخرہ کے بارے میں یہی کہوں گا کہ:

رفتید و لے نہ از دلِ ما

سالِ نو اور جاپان

عامر بن علی/ جاپان

کرسمس کا دن مسیحی دنیا میں خاندان سے متعلق ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں کرسمس کا عشائیہ اس تہوار کا سب سے اہم اور بنیادی رکن ہوتا ہے۔ جسے تمام لوگ عموماً اپنے اہل خانہ کے ساتھ مناتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا دن ہونے کے سبب مذہبی رجحان رکھنے والے خاندان کرسمس کی صبح گرجا گھر جاتے ہیں جہاں خصوصی دعائیہ تقریب ہوتی ہے۔ اس دن ولادتِ مسیح کے مختلف پہلوؤں پر پادری اپنے اپنے انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ کرسمس اگرچہ اب مذہبی سے زیادہ سماجی تہوار بن گیا ہے مگر پھر بھی اس کا تشخص اور تقدیس اب بھی روحانی نوعیت کی ہے۔ نیوائیر کا معاملہ بالکل ہی مختلف ہے، اس کا نقش رات کے بارہ بجے، باہر سڑکوں پر گھڑی کی بالائی جانب گھنٹوں اور منٹوں کی سوئیاں اکٹھی ہونے کے انتظار کا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آتش بازی اور پٹاخے شروع ہو جاتے ہیں، لوگ شہر کے مرکز میں خوشی سے جھومتے اور نعرے لگاتے ہیں، من چلے نئے سال کے نام جام ٹکراتے ہیں۔ ان ساعتوں میں عشاق پیمانِ وفا باندھتے ہیں۔ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ کرسمس اِن ڈور اور آمدِ سالِ نو کا جشن آؤٹ ڈور تہوار ہیں۔

جاپان میں عیسائی عقیدہ رکھنے والے لوگوں کی تعداد کل آبادی کا ایک فیصد بھی نہیں ہے، مگر کرسمس [illegible] سجے سجائے آپ کو ہر جگہ نظر آئیں گے۔ تمام ہوٹل، شاپنگ مال، دوکانیں، بازار کرسمس کی روشنیوں سے ٹمٹماتے نظر آتے ہیں۔ لوگوں میں بالکل وہی جوش و جذبہ نظر آتا ہے جو مسیحی اکثریتی آبادی والے ممالک میں نظر آتا ہے۔ روشنیوں اور رنگوں کا ایک دریا سرِ شام بہنا شروع کر دیتا ہے۔ گوکہ چراغاں کی ابتدا نومبر کے آخر میں شروع ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ جنوری کے اواخر تک چلتا ہے، مگر اس کا نقطہ عروج کرسمس اور نیوائیر ہی ہے۔ کرسمس ٹری کے ساتھ جا بجا سانتا کلاز کے مجسمے سجے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سرخ و سفید لباس میں ملبوس، سفید گالا داڑھی اور عینک والے مہربان بزرگ، سانتا کلاز کی سواری کی سج دھج، جس میں بچوں کے لیے تحائف لدے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ تحائف سے بھری کوچ اور اس کو کھینچنے والے بارہ سنگھے کے ماڈل جگہ جگہ رنگ و روشنیوں سے منور نظر آتے ہیں۔ بازار سے گزرتے ہوئے سرد ہواؤں کے ساتھ ان دنوں کرسمس اور نئے سال سے منسوب مدھر گیت دور و نزدیک سے سماعتوں سے ٹکراتے ہیں۔ کرسمس ٹری پر سجے لٹکتے آرائشی تحفے، رنگ برنگے ربن میں لپٹے، سرخ اور سبز ڈبوں میں بند اس کرسمس ٹری کے اردگرد بکھرے بہت سے مزیدار تحائف جنہیں بچے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

کرسمس اور سالِ نو کی لوٹ سیل کے تذکرے کے بغیر تو اس موضوع پر بات نامکمل ہی رہے گی۔ سرمایہ دارانہ نظام نے مذہبی نوعیت کے تہوار اور روحانی ایام کو کاروبار کے ساتھ اس طرح منسلک کیا ہے کہ سارا سال لوگ کرسمس سیل کا انتظار کرتے ہیں۔ جاپان جیسے بدھ مت اکثریتی ملک میں تو کرسمس کے سارے جشن کی بنیادی وجہ ہی کاروباری نوعیت کی ہے۔ اسی کارپوریٹ مفاد کے تحت جاپان میں کرسمس اور نئے سال کی رونقیں مسیحی ممالک کو بھی مات دیتی نظر آتی ہیں۔ ان دنوں کی لوٹ سیل پوری دنیا میں مشہور ہے۔

یہاں یہ تذکرہ بھی قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے کہ مشرقی یورپ اور روس کے علاوہ آرتھوڈوکس عیسائی مسلک کے لوگ جہاں بھی آباد ہیں وہ کرسمس کا تہوار سات جنوری کو مناتے ہیں۔ اس بارے میں ان کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ہوئی اس وقت جو کیلنڈر رائج تھا۔ اس کے مطابق یہ دن سات جنوری ہی بنتا ہے۔ بنیادی نقطہ یہ ہے کہ آرتھوڈوکس اور کیتھولک عیسائی نئے سال کے ساتویں دن میلادِ مسیح مناتے ہیں، رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ سمجھتے ہیں کہ یہ نئے سال سے پہلے یعنی 25 دسمبر کا دن ہے جبکہ روسی، یونانی آرتھوڈوکس اسے گریگورین کیلنڈر کے مطابق 7 جنوری کو مناتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ کہ فلسطین کے جس مقام پر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ہوئی اور اب وہاں کلیسا قائم ہے، وہاں بھی کرسمس 7 جنوری کو منائی جاتی ہے۔

لاطینی امریکہ میں دیکھا کہ دسمبر کے پہلے ہفتے سے ہی کرسمس کے جلوس نکلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ گاڑیوں کے یہ قافلے ریلی کی صورت میں ہوتے ہیں۔ ان میں سانتا کلاز اور کرسمس سے منسوب مختلف کرداروں کے لباس میں ملبوس لوگ گولیاں، ٹافیاں، اور چاکلیٹ بچوں میں تقسیم کرتے جاتے ہیں۔ کرسمس اور نئے سال کے گیتوں کی دھنوں پر جھومتے گاتے لوگ راستے میں ملنے والے لوگوں کی جانب ہاتھ ہلاتے جاتے ہیں اور کرسمس کے تحائف تقسیم کرتے جاتے ہیں۔ رضاکارانہ طور پر ان جلوسوں میں شامل لوگ اپنی گاڑیوں پر غبارے لگاتے ہیں اور میلادِ مسیح مبارک لکھوا کر چلتے ہیں۔ جلوس کے راستے میں آنے والے گھروں کی گھنٹیاں بجا کر بچوں کو سانتا کلاز کے لباس میں ملبوس افراد مٹھائیاں بانٹتے ہیں۔ روزانہ نکلنے والے ان جلوسوں کا نقطہ عروج 25 دسمبر ہوتا ہے۔

ان دنوں نئے سال کے کیلنڈروں اور ڈائیریوں کے تحائف دفاتر میں روز موصول ہوتے ہیں۔ دوست احباب ان تحائف کا تبادلہ بھی کرتے ہیں۔ محبت کرنے والے ان دنوں نئے سرے سے عہدِ وفا باندھتے ہیں۔ کرسمس پر اگر برفباری ہو جائے تو اسے ''وائیٹ کرسمس'' کہتے ہیں۔ برفباری سے اگرچہ سردی میں تو مزید اضافہ ہو جاتا ہے مگر نوجوان منچلے اس سردی اور برفباری کو انجوائے کرتے ہیں۔ کرسمس اور نئے سال کے درمیانی دنوں میں چھٹی جیسا ماحول ہوتا ہے۔ سرکاری طور پر جاپان میں پچیس دسمبر کی چھٹی نہیں ہوتی اور دفاتر معمول کے مطابق اپنے کام سرانجام دیتے ہیں۔ مرزا غالب جن کا یوم پیدائش بھی انہی دنوں، ستائیس دسمبر ہے، جس پر گوگل سرچ انجن نے اس بار 220 ویں سالگرہ پر اپنا صفحہ بطور خراجِ تحسین غالب کے نام منسوب کیا ہے، کیا خوب اس صورت حال کی ترجمانی اپنے لافانی شعر میں کر گئے ہیں۔

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

سمرقند اور تیمور لنگ

سرور غزالی

سمرقند میں ہم نے مختلف مقامات پر نصب تختے پر یہ دعویٰ لکھا دیکھا کہ دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے یہ ایک شہر ہے اور اس کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ زمانہ قدیم سے تسلسل کے ساتھ قائم و آباد چلا آ رہا ہے اور صنعت و حرفت و تجارت اور تہذیب و تمدن، ادب اور ثقافت کا مرکز رہا ہے یعنی وسط ایشیا میں علم و ادب کا گہوارہ اور حصول علم کا ایک ایسا مرکز رہا ہے جس نے بڑے بڑے اسکالر پیدا کیے۔ جوان بڑے بڑے مدارس میں درس و تدریس کے شعبوں سے منسلک رہے۔ یہ مدارس جن کی عمارتیں بھی ان کی بلند و بالا شان کی مظہر ہیں۔ ان عمارتوں کے طویل و عریض کھلے وکشادہ صحن، راہداری، انگنت درسی کمرے، طلبہ و اساتذہ کے رہائشی کمرے، ہر دو مقام سمرقند اور بخارا میں، یہ بات واضح کرتی ہیں کہ یہاں واقعی کبھی علم و ادب کا ایک ایسا سلسلہ رہا ہوگا جس میں طلبہ یہاں آ کر علم کی پیاس بجھاتے ہوں گے۔ اور یہاں ادب و ثقافت، آرٹ و مصوری کی تعلیم دی جاتی رہی ہوگی اور ہنرمند افراد تیار کیے جاتے ہوں گے۔ اور ان سب کا یہاں ایک بڑا مرکز رہا ہوگا۔ سمرقند میں قائم مدارس کی تمام تصاویر میں نے آپ کو دیکھ سکتے ہیں۔

یہ عمارتیں میدان ریگستان نامی چوک پر واقع ہیں۔ ان میں اولوغ بیگ مدرسہ سن تعمیر 14201417، تلا کوری مدرسہ سن تعمیر 16601646 اور شیر دور مدرسہ سن تعمیر 16361619 شامل ہیں۔ یہ عمارتیں نقش فن تعمیر کی طرز پر بنی ہیں۔ ان مدارس کی عظیم الشان عمارتیں جو پندرہویں اور سترھویں صدی میں تعمیر کی گئی اسلامی فن تعمیر اور آرکیٹکٹ کا اعلیٰ و یکتا نمونہ ہیں۔

بخارا میں جو آرک قلعے کے کھنڈرات دریافت ہوئے ہیں اس میں قلعے کے اندر ایک محل کے آثار بھی ملے ہیں۔ اور قلعے کے اندر محل و مساجد کے علاوہ ایسا ایک کورٹ جہاں اسٹیج کی طرح کی اونچائی پر بیٹھ کر قدیم زمانے کا سرادر یا والی دربار منعقد کیا کرتا تھا، بھی دریافت ہوا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا کمپلیکس ہے اور نصب تختے کی اطلاع کے مطابق ان کھنڈرات میں دفن یہیں ایک بہت بڑا خزانہ، جس میں سونا چاندی ہیرے جواہرات شامل تھے، بھی برآمد ہوا، جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اس علاقے کے اس زمانے کے، کم از کم سرادر تو بہت ہی زیادہ دولت مند رہے ہوں گے۔ شاہراہ ریشم کی تجارت کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔

سمرقند کو اس بات پر بھی بہت فخر ہے کہ ان کا ترک منگول رہنما تیمور انہی کے علاقے کا ایک فرد تھا۔ تیمور نے اپنے بچپن میں چنگیز خانی حکومت کا شیرازہ بکھرا ہوا پایا تھا۔ مگر اس نے اپنی سلطنت کو ایک دفعہ پھر سے وسعت دی، پورے ایشیا کو زیر نگو کر کے وسیع و عریض سلطنت میں بدل ڈالا۔ گو کہ اس کی عظیم سلطنت کے قائم رہنے کی معیاد بہت کم ہے مگر اس نے ایک بڑی عظیم سلطنت قائم کی۔ اس نے اپنی سلطنت کو اسلامی سلطنت بھی قرار دیا مگر منگول ہونا منگولوں کے لیے ہمیشہ ہی مسلمان ہونے سے زیادہ اولیت کا درجہ رکھتا تھا۔ اور آج بھی ایسا ہی ہے۔

تیمور بن ترغائی

تیمور کے معنی ترکی زبان میں لوہے کے ہوتے ہیں۔ وہ 18 اپریل 1336 کو کیش، سمرقند میں پیدا ہوا اور 19 فروری 1405 کو سمرقند میں فوت پا گیا۔ اس کے پوتے نے اس کی قبر پر عظیم الشان مزار تعمیر کروایا۔ جس میں مرتبے کے مطابق کئی دوسری اور بھی قبریں ہیں۔ وہ بعد میں امیر تیمور کے نام سے مشہور ہوا، زبردست فوجی کمانڈر، فاتح اور رہنما بن کر ابھرا۔

وہ ایک عام سے صحرائی خانہ بدوش قبیلے کے فرد سے ترقی کرتے ہوئے جنگیز خوانی چغتائی خاندان میں شادی کر کے ابھرتا گیا۔ اپنی سلطنت کو اسلامی اور شریعت کو ریاست کا قانون بنانا ایک طرف مگر مسلمانوں کے قتل عام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا دوسری طرف اس کا شیوہ یا سیاسی چال تھی۔ چونکہ منگولی تہذیب کو فوقیت دینا اس کے لیے سب سے اہم تھا۔ اور ریاست کا استحکام اسی طرح ممکن تھا۔ اس مقصد میں وہ اس قدر بڑھ گیا کہ قتل و غارت گری سے بھی بعض نہ آتا تھا۔ امیر تیمور کو خان ہونے کا درجہ تو کبھی نہ ملا مگر وہ خود کو چغتائی شاہی خاندان کا داماد، گرے جان کہلواتا تھا۔ اس کے مزار کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس قدر جاہ جلال کا مالک رہا ہوگا۔

گھر آپ جل گیا ہے جلایا کہاں گیا
خود راکھ بن گیا ہے بجھایا کہاں گیا
میں نے تو بھیس بدلے قسمیں بھی تھیں اٹھائیں
میرا یہ راز تم سے چھپایا کہاں گیا
آنسو بھی خشک اور ہیں لب بھی سلے ہوئے
اشکوں سے حال اپنا سنایا کہاں گیا
دولت تو اس کے ضبط کی ساری ہی چھن گئی
صبر و رضا کا گھونٹ پلایا کہاں گیا
معراج ان کے قدموں میں میری تھی دوستو
سر ان کے آستاں پہ جھکایا کہاں گیا
مجھ کو دعا شفا سے تو کوئی غرض نہیں
میں ہوں مریض عشق دکھایا کہاں گیا
مجھ کو نہ ہیر رانجھے نہ سسی کی ہے خبر
مجھ کو نصاب عشق پڑھایا کہاں گیا
حکمت سے کام لیتا ہوں میں سوچ کر
پھر بھی وہ میرے پاس بلایا کہاں گیا

عتیق الرحمٰن حکمت / حاصل پور

بقیہ انٹرویو: ڈاکٹر انوار احمد

گفتگو: عامر بن علی

س ادب سے شوق کی ابتدا کیسے ہوئی؟

ج میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا جب ناک کے معمولی آپریشن میں میرے والد کی وفات ہوئی میں پانچ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ مجھے جب پگڑی باندھی گئی تو اس کے مقابلے میں میرا سر چھوٹا تھا اس حادثے کے بعد مجھے استادوں کی شفقت ملی مگر بہت قریبی عزیزوں کے تکلیف دہ رویے بھی سامنے آئے، تاہم اپنی ماں کے ساتھ گل ٹیکس کے کارخانے میں مزدوری کا موقعہ ملا (ایک چادر کے کونے کی ترپائی کرنے کے چار آنے ملتے تھے اور تکیہ یا میز پوش کا ایک آنہ) یہی وجہ ہے کہ مجھے ان مصنفوں کو پڑھنے کا شوق ہوا جنھوں نے غریبوں اور مزدوروں کے بارے میں لکھا یعنی پریم چند، کرشن چندر بعد کے زمانے میں منٹو۔ یوں میں سوشلزم کے بارے میں کچھ پڑھے بغیر سوشلسٹ یا ترقی پسند ہو گیا۔

س عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

ج میرا نصب العین میٹرک تک تعلیم پانا تھا تا کہ محکمہ ڈاک اپنے وعدے کے مطابق مجھے اپنے والد کی جگہ نوکری دے، مگر میرے 781 نمبر آ گئے اور دو برس کے لئے وظیفہ مل گیا، یہی کچھ ایف اے اور بی اے میں ہوا اور پھر بی اے میں بھی بہت اچھا رزلٹ آیا کہ ایمرسن کالج میں ایم اے اردو میں ایک روپیہ فیس دے کر داخلہ مل گیا۔ میرے اردو کے استاد سید ریاض حسین زیدی نے پرنسپل میاں محمود احمد کو لکھ کے دیا کہ اگر اسے وظیفہ نہ ملا تو اس کے واجبات میں ادا کروں گا۔ ایم اے کے دوران مجھے ملتان میں ہی بہت مشفق استاد ملے، پروفیسر خلیل صدیقی، سید افتخار حسین شاہ، سید صفدر امام، سید اقبال عباس نقوی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر اے بی اشرف اور پھر پی ایچ ڈی کے نگران ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

س بلوچستان میں بھی آپ کا قیام رہا، یہ عرصہ کیسا گزرا؟

ج گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں میرا بطور ایڈہاک لیکچرار تقرر 4 مئی 1971 کو ہوا اور یوں مجھے ایک ایسے صوبے میں کام کرنے کا موقع ملا جہاں زبانوں اور ثقافتوں کا جال بچھا تھا، کوئٹہ میں مجھے سیکھنے کا موقع ملا میری ایم اے کی کلاس میں عبدالخالق بلوچ تھا، جس نے بعد میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کیا اور بلوچستان یونیورسٹی میں صدر شعبہ رہا۔ دو طالب علم پٹھان تھے رشید اور عبدالحمید، اسی طرح ڈاکٹر عطا میراں (معاشیات) حافظ جلیل (فلسفہ) سید خلیل احمد (انگریزی، نامور افسانہ نگار) سعید احمد رفیق (فلسفہ) اور اپنے استاد خلیل صدیقی سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ بے شک میں ملتانی ہوں مگر میں جہاں کہیں گیا اندرون پاکستان (رحیم یار خان، فیصل آباد، سیالکوٹ، اسلام آباد) اور بیرون ملک (انقرہ، اوساکا) اسے درس گاہ خیال کیا۔

س کسی ادبی تحریک کا بھی کبھی حصہ رہے ہیں؟

ج ملتان یونیورسٹی سے میں 1976 میں وابستہ ہوا یہاں بھی اپنی دانست میں سماجی تبدیلی کے خواب کا تعاقب کیا، ترقی پسند مصنفین کی صف بندی میں رہے۔ یونیورسٹی میں میرا شعبہ اردو کا تھا مگر میرے نظریات کی وجہ سے دوسرے شعبوں کے نوجوان میرے قریب آتے تھے اور جو باتیں وہ بسا اوقات اپنے استادوں یا والدین سے نہیں کہہ سکتے تھے مجھ سے کہہ لیتے تھے اور میں ہر ممکن حد تک ان کی مدد کرتا تھا یہی وجہ ہے انگریزی شعبے کا روف کلاسرا، تاریخ کی ڈاکٹر عصمت ناز اور سیاسیات کا ڈاکٹر فاروق زین اب بھی تعلق نباہتے ہیں بہت سے میرے دیگر شاگردوں کی طرح۔

س کالم نگاری کیوں ترک کر دی؟ آپ کا کالم وعدہ خلافی تو مقبول ترین تھا؟

ج روزنامہ دنیا میں کالم لکھتا تھا، اس بہانے اپنے پرانے سکول کالج یا سیالکوٹ میں علامہ اقبال کی والدہ امام بی بی کے نام پر یادگاری فنڈ یا ملتان میں خلیل صدیقی یادگاری فنڈ یا فیصل آباد میں ابن حنیف یادگاری فنڈ قائم کرنے میں مدد ملتی تھی، اور مجھے ان کالموں کا معاوضہ بھی ملتا تھا مگر میرا ایک آدھ کالم روک دیا گیا، ادھر سہیل وڑائچ میرے ایک شاگرد جمشید رضوانی کے ساتھ آیا اور کہا روزنامہ جنگ میں ہفتے کے دو دن کالم لکھیں ممکن ہے اس نے پیشہ ورانہ داؤ آزمایا ہو یا خلوص سے کہا ہو بعد میں وہ انتظامی طور پر ویسے طاقت ور نہ رہے ہوں، بہر حال جب چھوڑ دیا روزنامہ دنیا میں لکھنا تو چھوڑ دیا۔

س تمام زندگی تدریس سے منسلک رہے۔ جاپان میں بھی اردو پڑھائی، یہ تجربہ کیسا تھا؟

ج بیرون ملک جاپان میں میرا قیام کئی اعتبار سے یادگار تھا، یاما نے پاکستان میں آئے تو ملنے کی کوشش کرتا ہوں۔

س آپ مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین رہے۔ اس ادارے کی سربراہی کرتے ہوئے آپ نے اردو زبان کے فروغ کے لیے کافی کام کیا۔ کیا آپ کو اپنی اس محنت کے کوئی اثرات آج محسوس ہوتے ہیں؟

ج مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشیں کی پوسٹ مشتہر ہوئی تھی، میں تب اوساکا میں دو برس پورے کر چکا تھا مجھے ایک سال کی توسیع کی پیش کش کی گئی تھی مگر میں نے مقتدرہ کے منصب کے لئے اپلائی کیا میرا انٹرویو ہوا اور میرا تقرر تین برس کے لئے ہوا مگر افتخار چودھری کا فیصلہ آ گیا کہ 65 برس ریٹائرمنٹ کے لئے حتمی ہے۔ ڈیڑھ برس میں میں نے اپنی دانست میں کچھ کام کئے۔ ملازمین کی پنشن کے لئے اضافی گرانٹ لایا، 36 کتب شائع کیں اور کچھ اور کام بھی کئے، اخبار اردو کے ذریعے یہ پیغام دینے کی کوشش کی کہ مقتدرہ صرف صدر نشیں کا نام نہیں۔

س آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟ مستقبل کے کیا منصوبے اور ارادے ہیں؟

ج مستقبل قریب میں اردو کے 36 ناول نگاروں پر ایک کتاب لانے کا ارادہ ہے۔

س: مشاعروں کے ہائی جیکر شعراء کے بارے میں کیا کہیں گے؟

ج: گروپ بندی نے ہمیشہ ادب کو نقصان پہنچایا ہے۔ مشاعروں کے ہائی جیکر ہر دور میں رہے ہیں اور رہیں گے۔ پاکستانی ادب اور معاشرے میں شاعروں کے ان خود ساختہ گروپ لیڈروں سے جان چھڑانا مشکل ہے۔ شاعروں کے ایک خود ساختہ گروپ کا لیڈر یا بقول شاعر ہر سرکاری و غیر سرکاری مشاعرے میں اپنے ہی مخصوص دوستوں کے نام لکھواتا ہے۔ جس کی وجہ سے کئی باصلاحیت تخلیق کار ظاہری طور پر پیچھے رہ جاتے ہیں۔

س: ناقدین ادب کے لیے کتنے مفید اور کتنے خطرناک ہیں؟

ج: ماضی میں ناقدین ادب کے لیے خاصے مفید بھی ہوتے تھے اور خطرناک بھی۔ حسن عسکری اور مظفر علی سیّد جیسے اہم نقاد کسی بھی نئے یا پرانے تخلیق کار پر سفاکانہ رائے دے دیتے تھے جو لکھاری کے لیے مفید مشورہ بھی ہوتی تھی اور بعض اوقات وہ نقاد سے ناراض بھی ہو جاتا تھا۔ یہ ایک طرح سے ادیب کی اصلاح کا پہلو بھی تھا۔ مگر آج کل ناقد اور تخلیق کار کا باہمی رشتہ توصیف و تعریف تک محدود ہے۔ یوں آج کل ناقد نہ مفید رہے ہیں اور نہ ہی خطرناک ہیں۔ تاہم مثبت تنقید مصنف کی فکری پروازوں سے کثافتوں کو چھان کر اسے ہیرے جیسا چمکدار بنا سکتی ہے۔

س: آپ نے اتنی ڈھیروں کتابیں کیوں لکھی ہیں۔ آپ کے پیش نظر کیا مقاصد ہیں؟

ج: کیوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تخلیقی عمل خدائے بزرگ و برتر کی عطا سے ہی رونما ہوتا ہے۔ بقول معروف شاعر شہزاد احمد ''تخلیقی عمل انسان کے لیے اب بھی ویسے ہی ناقابل فہم چیز ہے جیسی کہ یہ اُس وقت تھی، جب شعور کا آغاز ہوا تھا۔ اس کا ایک گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر انسان کی گرفت کسی حد تک مضبوط ہوئی ہے۔'' شہزاد صاحب نے 32 برس قبل میری کتاب کے دیباچے میں یہ سطریں لکھی تھیں۔ تب سے میرا تخلیقی سفر جاری ہے۔ اس میں میرے والد شاعر درویش بشیر رحمانی کی دعائیں بھی شامل ہیں۔ جنھوں نے مجھے چالیس کتب شائع ہونے کی نوید دی تھی۔ لکھتے وقت میرے پیش نظر مقاصد ہی رہے ہیں۔ شعر و نثر دونوں میں میرا نظریہ فن انسان اور انسانیت سے محبت ہی رہا ہے۔

س: آپ نے بچوں کا ادب بھی تخلیق کیا ہے۔ اس حوالے سے آپ کی کیا خدمات ہیں؟

ج: میں نے لکھنے کا آغاز بچوں کے ادیب کے طور پر کیا تھا۔ میں نے بچوں کے لیے تقریباً چار سو کہانیاں، نظمیں اور مضامین لکھے ہیں۔ کئی تخلیقات کا ریکارڈ بھی نہیں۔ اس حوالے سے میرا خاص کام سانحہ پشاور کے تناظر میں لکھا گیا ناول ''زندہ ہیں شاہین'' اور شاعر مشرق علامہ اقبال کے اشعار پر مشتمل کہانیوں کی چھ کتب ہیں، جن میں سراغ زندگی، مقدر کا ستارہ، لوح و قلم، اُستاد کا احترام، بندۂ مزدور اور جوانوں کو مری آہِ سحر دے شامل ہیں۔ ''سراغ زندگی'' کو اقبال اکادمی کی طرف سے تین لاکھ ''اُستاد کا احترام'' کو نیشنل بک فاؤنڈیشن کی طرف سے 55 ہزار اور سند اور ''لوح و قلم'' کو 2019ء کی اول انعام یافتہ کتاب اور شیلڈ تسنیم جعفری ایوارڈ کے طور پر عطا ہوئی۔ میری بچوں کی نظموں کی کتاب ''بچوں کی پھلواری'' کو بھی 2020ء کا تسنیم جعفری ایوارڈ ملا تھا۔

س: کیا ادب کو زندگی سے جدا کر کے دیکھا جا سکتا ہے؟

ج: ادب ہماری زندگیوں سے جڑا ہوا ہے۔ اس لیے ہم اسے خود سے جدا نہیں کر سکتے۔ روزِ اول سے ہی ادب شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کی زندگی کا حصہ رہا ہے اور آج کے جدید دور میں اس کی ساخت میں نت نئی تبدیلیاں در آئی ہیں۔ جو انسانی معیشت اور معاشرے پر گہرے اثرات ڈال رہی ہیں۔

س: کیا ادیبوں کی حوصلہ افزائی کا واحد ذریعہ ایوارڈ ہیں؟

ج: ایوارڈز واحد ذریعہ تو نہیں لیکن فی زمانہ ایوارڈ کسی حد تک نئے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کا باعث بنتے ہیں۔ اصل میں جب کسی بھی نئے یا پرانے لکھنے والے کو سٹیج پر باعزت طریقے سے بلا کر اعزاز یا ایوارڈ سے نوازا جاتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ اسے اُس کی محنت کا صلہ مل گیا ہے۔

س: ادب کی ترویج کے لیے قائم کیے گئے سرکاری اداروں کی کارکردگی سے آپ مطمئن ہیں؟

ج: سرکاری ادبی ادارے ادب کی ترویج و ترقی کے لیے ہی بنائے جاتے ہیں، لیکن افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ یہاں بھی زیادہ تر گروپنگ اور اقرباء پروری کا سلسلہ جاری ہے۔ ایسی صورتِ حال میں تخلیق کاروں میں بے چینی پائی جاتی ہے۔

س: آپ ادب لطیف جیسے لطیف پرچے کے مدیر

مجھے یہ تجربہ کیسا رہا؟

ج میں 1994-95ء میں تقریباً دو برس ادبِ لطیف کا مدیر رہا۔ پھر سرکاری ملازمتی امور کے سبب مجھے پشاور جانا پڑا اور ادبِ لطیف کا ساتھ چھوٹ گیا اور۔ یہ نوجوانی کا زمانہ تھا۔ تاہم اصل اعزاز آپا صدیقہ بیگم جیسی عظیم ہستی کے ساتھ مل کر پرچے کی ادارت کرنا تھا، جس کے لیے میں آج تک فخر محسوس کرتا ہوں۔ ادبِ لطیف پر لکھے گئے ایم فل کے مقالے میں بھی میرا ذکر ہے۔ میں نے اپنے دور میں ادبِ لطیف کے دو خاص نمبروں سمیت کئی اہم شمارے شائع کیے ہیں۔ اس کے علاوہ میں ادبِ لطیف کی تاریخ کے کم عمر ترین مدیران میں سے ایک ہوں۔

س کن شاعروں اور ادیبوں سے متاثر ہیں؟

ج بہت سے ہیں۔ شاعروں میں میر، غالب، حضرت علامہ اقبال، فیض احمد فیض، احمد فراز، مجید امجد، شکیب جلالی، منیر نیازی اور شہزاد احمد مجھے پسند ہیں۔ ادیبوں میں عبداللہ حسین، اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے علاوہ رضیہ بٹ کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ مزاح میں مشتاق احمد یوسفی لاجواب و بے مثال ہیں۔

س اردو سائنس بورڈ اور دیگر ملازمتوں میں آپ کی ذمہ داریاں کیا تھیں اور آپ نے کس طرح نبھائیں۔ کون سے مسائل درپیش آئے؟

ج میرا اصل ادارہ پاکستان ملٹری اکاؤنٹس ہے۔ جو فوج، نیوی اور ایئر فورس کے حسابات اور ان کے واجبات تک کی ادائیگی کے لیے اپنی خدمات ادا کر رہا ہے۔ بہت سے مسائل کے باوجود بھی ملازمتیں تن دہی سے اپنی خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ مجھے بھی یہاں 36 برس ہو گئے ہیں۔ تاہم اس دوران تین برس میں وقتی طور پر ڈیپوٹیشن پر اردو سائنس بورڈ سے منسلک رہا ہوں۔ یہاں قیام کے لیے میں معروف شاعر، بہترین منتظم اور دیرینہ مہربان جناب خالد اقبال یاسر کا ممنون رہوں گا۔ میں نے اس ادارے میں رہ کر تین کتب تحریر کیں۔ کئی کتب کی پروف ریڈنگ، ایڈیٹنگ اور تراجم بھی کیے۔ تاہم یاسر صاحب کی ٹرانسفر کے بعد مجھے کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کی تفصیل بتانا میں مناسب نہیں سمجھتا۔

س اپنے والد صاحب کی زندگی اور فن پر روشنی ڈالیں؟

ج میرے والد محترم شاعر درویش، مصورِ احساس جناب بشیر رحمانی ایک درویش منش انسان تھے۔ انہیں برسوں پہلے اپنی شاعری کی رنگا رنگی اور روایت و جدت سے ہم آہنگ شاعری کرنے پر مصورِ احساس کا خطاب دیا گیا تھا۔ والد صاحب کی شاعری کا آغاز ملٹری اکاؤنٹس کی ملازمت کے دوران ہوا جہاں انہیں عبدالحمید عدم، علامہ بشیر رزمی، یونس نشاط، نور بجنوری، عبدالحمید تبسم، طارب جمالی اور منیر منتظر جیسے معروف شعراء و ادباء میں اُٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا۔ 1991ء میں محکمے سے ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ''فنون'' جیسے عالمی شہرت یافتہ ادبی جریدے سے منسلک ہوئے اور جناب احمد ندیم قاسمی اور محترمہ منصورہ احمد کے ساتھ مل کر کام کیا۔ والد محترم کی دو نعتیہ کتب ''بشارتیں'' اور ''زیارت'' شائع ہوئیں۔ غزلیہ مجموعہ ''سلگتا سمندر'' اور ''تخاطب'' اس کے علاوہ ہیں۔ انہوں نے جواں عمری میں ایک ناول بھی لکھا جس کا دیباچہ شوکت تھانوی نے لکھا تھا۔

س بشیر رحمانی ادبی ایوارڈ کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟

ج بشیر رحمانی ادبی ایوارڈ کے کئی اغراض و مقاصد ہیں۔ ہر سال جاری ہونے والے اس ایوارڈ کا اولین مقصد تو والد محترم کی شخصیت اور فن سے دنیائے ادب کو آگاہ کرنا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ ان کے نام اور کام کو زندہ رکھنے کی کوشش ہے۔ جو ان شاء اللہ میرے بعد بھی جاری رہے گی۔ ہماری ایک مضبوط ٹیم ہے جو پروگرام کو کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔ ایوارڈ کا دوسرا اہم مقصد ہر سال یا دو سال بعد شائع ہونے والی کتب کی پذیرائی ہے۔ پچھلے تین برسوں سے ہم تمام موصولہ کتب کو ایوارڈ، اسناد اور کتب پیش کر رہے ہیں۔ ممکن ہے آئندہ یہ سلسلہ اول، دوم اور سوم تک محدود ہو اور کوئی کیش پرائز بھی شامل کیا جائے۔

س ارژنگ کے قارئین کے لیے پیغام

ج ارژنگ ایک معیاری ادبی جریدہ ہے، جو بھرپور انداز سے ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ اسی طرح اس کے قارئین بھی بہت خوبصورت اور قابلِ احترام ہیں۔ میرا قارئین کے لیے یہی پیغام ہے کہ آج ہم مشکل ترین دور سے گزر رہے ہیں۔ جس میں لوگوں کا ایک دوسرے سے ربط باہمی اور محبت کا رشتہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ لہٰذا معاشرے کی بہتری کے لیے ضروری ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ کھلے دل کے ساتھ جڑے رہیں۔ تاکہ آپس کا یہ میل جول بہترین معاشرے کی بنیاد رکھ سکے۔ کیوں کہ فرد کا فرد سے رشتہ ہی انسانیت کی معراج ہے۔

لیلیٰ کی سہیلی

وحید الرحمٰن خان/لاہور

صوفیہ بیدار بنیادی طور پر شاعرہ ہیں اور شاعرہ بھی ایسی کہ عالمِ خواب میں بھی ہوں تو لوگ انہیں ''بیدار'' کہتے ہیں۔ سو، ایسی بیدار ذہن خاتون کے بارے میں سخن گستر ہونا، میرے جیسے گراں خواب کے لیے ایک دشوار مرحلہ ہے لیکن میری مردانہ انا مجھ سے کہتی ہے کہ روسیاہ! اگر تجھ سے یہ نہ ہو سکا تو صوفیہ بیدار ایک ایسا افسانہ لکھ کر تیرے منہ پر ماریں گی جس کا مرکزی کردار ذہین خاتون کی قابلیت کے اعتراف میں بخل سے کام لیتا ہوگا اور صوفیہ بیدار سے کوئی بعید نہیں کہ افسانے میں اس ''حریفِ حوا'' کا نام وہی تجویز کریں جوا ے خامہ خراب! تیرا حقیقی نام ہے۔

آخر ''جمال احسانی'' نے ان کا کیا بگاڑا تھا کہ ایک افسانے میں ان کا جو نقشہ کھنچا ہے، وہ کسی جمال کا نہیں، جمل کا محسوس ہوتا ہے۔ نقشہ ملاحظہ فرمایئے:

''سرخ ویلوٹ کا کوٹ، سیاہ شائننگ پینٹ شرٹ، بھاری بھرکم جثے پر منڈھے ہوئے تھے۔ بمشکل تمام وجود کو ایئر ویز کے کنگ سائز جہاز کی مختصر سیٹ میں لادے جمال احسانی پہلو بدلنے کی کوشش میں ہلکان ہو ہو جاتا۔ سامنے کا منظر جو جمال احسانی کے گھر کی ٹپکتی دولت کا منہ بولتا ثبوت بنا ہوا تھا، کسی صورت اپنی کشش کم نہ ہونے دے رہا تھا۔ معاً جمال، جس کا شاید کوٹ یا پھر موٹاپے کی وجہ سے سانس دشوار تھا، وہ ایک آدھ فقرہ ادا کر کے منہ ادھ کھلا چھوڑ دیتا۔ جمال اسی اثنا میں محض دائیں بائیں موٹی گردن گھماتا ارے، ارے ہی کہہ پا رہا تھا۔''

تو صاحبو! عافیت اسی میں ہے کہ سمند انا سے اترا جائے، کان سے قلم اُتارا جائے اور اسے صفحہ قرطاس پر چلایا جائے اور دل ہی دل میں وہ مصرع پڑھا جائے:

''وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے''

یا پھر وہ مصرع:

''چل میرے خامے! بسم اللہ

صوفیہ بیدار ایک پختہ کار شاعرہ اور ایک نو وارد افسانہ نگار ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے بیخود دہلوی کا ایک شعر پیش کرتا ہوں:

سودائے عشق اور ہے، وحشت کچھ اور شے
مجنوں کا کوئی دوست فسانہ نگار تھا

مجنوں کو خدا جانے عشق کا سودا تھا یا وہ وحشت کا زیر اثر تھا لیکن اسے جو دوست میسر آیا، وہ ایک افسانہ نگار تھا جس نے زیب داستان کی خاطر بڑھا چڑھا کر مجنوں کو اس انداز میں پیش کیا کہ آج بھی اسے سردارِ جنوں تصور کیا جاتا ہے:

غم مجنوں کا آوازہ بہت ہے
یہ سکہ آج بھی چلتا بہت ہے

لیکن وہ جو لیلیٰ تھی، اسے کوئی پوچھتا نہیں۔ کس نمی پرسد کہ ''لیلیٰ'' کون ہو؟ کا اگر ذکر ہوتا بھی ہے تو وہ ذکر خیر نہیں ہوتا بلکہ اسے ایک سیاہ فام دوشیزہ کے طور پر یاد کیا جاتا ہے جسے مجنوں کے حسنِ نظر نے حسین بنا دیا تھا۔ لیکن اب لیلیٰ کو مژدہ ہو کہ شہر لاہور میں اس کی سہیلی نے جنم لے لیا ہے، نام جس کا صوفیہ بیدار ہے اور جو ایک افسانہ نگار ہے اور افسانہ نگار بھی ایسی کہ عالم خواب میں بھی ہوں تو لوگ انہیں ''بیدار'' کہتے ہیں۔

صوفیہ بیدار ''ہر فن لیلیٰ'' قسم کی خاتون ہیں۔ فکر سخن میں سر کھپاتی ہیں، اچھی موسیقی پر سر دھنتی ہیں۔ کوچہ صحافت میں ایک بہانے سے آنا جانا رہتا ہے، کالم نگاری کرتی ہیں۔ طوطیِ شیریں مقال ہیں اور ایک زمانے میں ٹی وی پر ان کا طوطی بولتا تھا۔ افسری بھی کی ہے اور فقیری بھی۔ صوفیانہ کلام شوق سے سنتی ہیں۔ یہ شاید نام کا اثر ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بعض مریدین انہیں ''صوفیہ بیدار'' کے نام سے کیوں لکھتے اور پکارتے ہیں۔ یہ تو خیریت گزری کہ وہ انہیں ''صوفیا کرام'' نہیں کہتے۔ بہر حال مجھے تو یہاں یہ اعتراف کرنا ہے کہ اس خاتون کی شخصیت میں رنگا رنگ ''کثرتِ نمایاں'' ہیں اور اب اس رنگینی بہار میں ایک اور رنگ کا اضافہ ہوا ہے اور یہ ہے افسانہ نگاری کا رنگ۔

''رنگریز'' صوفیہ بیدار کا اولین افسانوی مجموعہ ہے اور اس میں انہوں نے لیلیٰ کا افسانہ سنایا ہے۔ میں نے یہ افسانہ بہت دلچسپی سے سنا ہے اور میں یہ کہہ سکتا ہوں:

سنتا ہوں بڑے شوق سے ''افسانہ لیلیٰ''
کچھ اصل ہے، کچھ خواب ہے، کچھ طرز ادا ہے

صوفیہ بیدار نے بہت شوق سے لیلیٰ کی محبت کا افسانہ پیش کیا ہے، ہمیں لیلیٰ کے احساسات سے آشنا کیا ہے اور لیلیٰ کے جذبات کو زباں دی ہے۔ وہ ہمیں بتاتی ہیں کہ ہجر میں لیلیٰ پر کیا صدمے گزرتے ہیں اور وصل میں کیسے کیسے اندیشے ستاتے ہیں۔ صوفیہ نے کان لگا کر لیلیٰ کے دل کی دھڑکنوں کو سنا ہے اور اس صدائے دل کو ہمیں بھی سنایا ہے۔ کبھی کسی کردار کی زبانی اور کبھی اپنی زبانی!

ایک حالِ دل بتاتی ہیں:

''محبت کی عدم موجودگی میں اس کی حفاظت کس

قدر دل فریب فریضہ ہے۔ مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میں نے محبت کو کھو دینے کے بعد دریافت کیا ہو، جیسے کوئی عمر رفتہ سے خوش کن منظر اُٹھا کر باقی ماندہ آرام سے آزاد ہو گیا ہو۔ تو یہ تھی محبت؟ سب کچھ صاف صاف، سب کچھ واضح ...... آئینے کی طرح روبرو، کچی یادوں میں پٹ سن کی رچی بسی خوشبو جیسی۔ کسی سچے عاشق کی پیشانی جیسی۔''

ایک اور مقام پر ''محبت'' کے بارے میں لکھتی ہیں:

''نہ بتاشے بٹے، نہ ڈھولکی کی تھاپ، نہ سہاگ کے گیت اور میں اس کی ہو گئی۔ کہاں دنیا؟ کون روکے کا مجھے؟ میرے دل کو یہ عشق ہے، کاروبار نہیں جو سوچ سمجھ کر کیا جائے جس میں دو پارٹیاں بٹھائی جائیں، فیصلے ہوں، تاریخیں رکھی جائیں۔ عشق میں تاریخیں نہیں رکھی جاتیں، وہ تو اپنی تاریخ خود رقم کرتا ہے۔''

صوفیہ بیدار نے ہمیں اپنے افسانوں میں جس لیلیٰ کی کہانی سنائی ہے، وہ محض داستان کا کردار نہیں، وہ محض محبوبہ نہیں، وہ خاتونِ خانہ بھی ہے، مادرِ مہربان بھی ہے، دفتر میں مصروفِ کار بھی ہے، رونقِ بازار بھی ہے۔ وہ پاک باز ہے، وہ سہاگن ہے اور کہیں تنہا ہے۔ مختصر یہ کہ صوفیہ بیدار کی افسانوی کائنات میں وجودِ زن کی کئی صورتیں ہیں اور ان تمام صورتوں کو مردانہ استحصال کا سامنا ہے۔ صوفیہ بیدار نے اس استحصال کے خلاف بغاوت کا علم اُٹھایا ہے، وہ کبھی زیرِ لب احتجاج کرتی ہیں اور کہیں بآوازِ بلند نعرہ زن ہوتی ہیں۔ وہ کہیں شعلہ ہیں، کہیں شبنم ہیں۔

صوفیہ بیدار لیلیٰ کی سچی سہیلی ہیں اور انہوں نے لیلیٰ کا افسانہ ہی نہیں، مقدمہ بھی پیش کیا ہے اور اس انداز میں پیش کیا ہے کہ گمان گزرتا ہے کہ وہ لیلیٰ کی سہیلی ہیں یا خود لیلیٰ ہیں؟

فسانچے

عاصم بخاری / میانوالی

دو گردے

ارشد نے والد کی جائیداد و وراثت سے بڑی بہن کو جو اکلوتی بھی تھی، محروم کر دیا۔ بہن نے احتجاج کیا تو اس سے بہن سے تعلق توڑ لیا۔

کچھ عرصہ بعد اچانک بہن کو معلوم پڑا کہ اس کا بھائی بہت بیمار ہے۔

جیسا بھی تھا، تھا تو ماں جایا ہی ناں۔ سو وہ رہ نہ پائی اور کام کاج چھوڑ کے بھیا کی خیریت دریافت کرنے ہسپتال جا پہنچی

"بھیا۔۔۔آپ کیسے ہیں؟ کیا ہوا ہے آپ کو؟

"تمھیں کس نے بتایا کہ میں بیمار ہوں؟

"گاؤں والوں نے۔ میں رہ نہیں پائی، دوڑی چلی آئی۔ اب کیسے طبیعت ہے؟

ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟

کیا مسئلہ ہے؟

"گردے کام چھوڑ چکے ہیں۔"

بھائی کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو دل بھر آیا۔ اسے تسلی دیتے ہوئے گلے لگایا اور بولی

"تجھے کبھی تتی وا نہ لگے۔ میرے جیتے جی تمھیں دکھی ہونے کی کوئی لوڑ نہیں۔ مری مٹی کی ایک ہی تو نشانی ہو۔ بہن حاضر ہے میرے دونوں گردے حاضر ہیں۔

بھائی نے فرطِ جذبات سے بہن کو گلے سے لگا لیا۔

ننھیال

دسمبر کے آخری ہفتے صبح سویرے فیاض اپنے کمرے میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا کہ کچن سے بیگم کی آواز بلند ہوئی۔

سرتاج۔۔۔" آٹا اور گھی ختم ہے۔ ناشتہ کیسے بنے؟

"اچھا اچھا" کچھ کرتے ہیں اس نے تسلی دی۔

"اتنے شور کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے کچھ سوچنے دو"

چند لمحے بعد فیاض نے حیرت سے سیل فون کو گھورا اور چہک کر بولا

"بیگم۔۔۔بیگم۔۔۔خوش خبری

۔۔۔خوش خبری

"کیا ہوا۔۔۔؟"

"چھٹیاں چھٹیاں، بچوں کی سردیوں کی چھٹیاں ہو گئیں۔"

تو پھر۔۔۔!

تم اپنے میکے کا چکر لگا لو۔ بچے بھی کب سے ضد کر رہے ہیں"

"سچ"

سچ"

بچے بھی خوشی سے ناچنے لگے

⊙⊙⊙

بدگمانی ہی سے تکرار کے پہلو نکلے
دل ملانے سے سدا پیار کے پہلو نکلے

ہاتھ پتھر کے ہوئے راہ مشقت میں مرے
پھر بھی کب کان سے دینار کے پہلو نکلے

پیر کامل نے کوئی عقدۂ دل کھولا تو
اس کی ہر بات سے اسرار کے پہلو نکلے

راہِ الفت میں محبت کا بھرم ٹوٹا تو
لشکرِ یار سے اغیار کے پہلو نکلے

سایۂ پیڑ میں رکنے کا خیال آیا تو
منزلِ شوق سے رفتار کے پہلو نکلے

جس قدر شب کی سیہ رات کا پھیلا آنچل
اس کے ہر تار سے انوار کے پہلو نکلے

دشت کی پیاس میں جب تیرا دہن یاد آیا
ریگ زاروں میں بھی انہار کے پہلو نکلے

صاحبِ فہم و فراست تھے جہاں پر تابش
میں نے دیکھا وہیں تلوار کے پہلو نکلے

شہزاد تابش / لاہور

شاعروں کے تخیلات پر کچھ ادبی اجتہاد

امجد محمود چشتی/میاں چنوں

بھلے عمل میں متحرک نہ سہی مگر شعراء معاشرے کے انتہائی ذہین لوگ ہوتے ہیں اوران کی پروازِ تخیل ،ماورائے ثریا ہوتی ہے۔یہ بڑے بڑے انقلابوں ،بلووں اور معاشقوں کے راہ ہموار کرتے ہیں ۔بس زرا عائلی اور خاص کر مالی حالات ناگفتہ بہ رہتے ہیں۔شعرا تعارف کے سوا ہر شئے کے محتاج ضرور سہی مگر خودداری و وضع داری کے موجب اظہارِ احتیاج کے محتاج نہیں ہوتے ۔شیکسپئر نے تو مذاق میں کہا تھا کہ شاعر، عاشق اور پاگل کا تخیل ایک جیسا ہوتا ہے اور اسلام نے بھی بس مصلحتاً شاعری کی حوصلہ شکنی کی مگر وہ شعرا اور علماء کے سوا کون ہیں جو ایک پھول کے عنوان کو سو رنگ سے باندھ سکیں۔ادب سے شغف رکھنے والوں نے شاعروں کو خوب پڑھ رکھا ہے ۔پرانے شاعروں کے کئی تخیلات آج کے تقاضوں سے میل کھاتے نظر نہیں آتے۔اس لیے راقم نے چند شعرا کے کچھ اشعار کو،،مکافاتِ تخیلات،، سے دوچار کرنے کی جسارت کی ہے۔سبطِ حسن نے اپنی کسمپرسی کا رونا ایسے رویا ۔

دیوار کیا گری میرے خستہ مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لیے

مانا کہ پرانے شاعر پکے مکان بنانے کی استطاعت اور نیت نہیں رکھتے تھے مگر آج سوشل میڈیا کی بدولت ایک متشاعر بھی متمول ہے۔لہٰذا ایسی ناشکری مناسب نہیں۔اب اس تخیل کو کچھ ایسے بدلتے ہیں کہ،

دیوار کیوں گرے میرے پختہ مکان کی؟
کیوں لوگ میرے صحن سے رستے بنا سکیں؟

احمد فراز اگرچہ خاصے متمول تھے مگر شاعرانہ خصوصیات سے بھی مجبور تھے۔ایک جگہ لکھا کہ

ان بارشوں سے دوستی اچھی نہیں فراز
کچا تیرا مکان ہے کچھ تو خیال کر

مگر اب شاعروں کے گھروں کی ایسی صورت حال نہیں دِکھتی۔ویسے بھی شاعر بادل، بارش اور ساون کے دلدادہ ہوتے ہیں۔میں تو کہوں گا کہ

ان بارشوں سے دوستی جاری رکھو فراز
پکا تیرا مکان ہے کچھ نہ ملال کر

میر تقی میر سے منسوب اس شعر میں بڑی دور کی پھینک گئی کہ ارشد ندیم بھی پیچھے رہ گئے۔

مگس کو باغ میں جانے نہ دیجو
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

مگر آج موم بتی کی ضرورت نہیں رہی اس لیے ہمارے خیال میں اب مگس کو باغ میں جانے کی اجازت دے دینی چاہیے، کہ

مگس کو باغ میں اب جانے دیجو
نہیں اب خون پروانے کا ہوگا

اقبال جیسے عظیم شاعر نے نرگس کو مایوس اور احساسِ کمتری کا شکار کر دیا کہ وہ ہزاروں سال روتی ہے تب کوئی اس کو چاہنے والا ملتا ہے۔مگر ہم نرگس کو یہ کہہ کر موٹیویٹ کرتے ہیں ، کہ

بڑی بے عقل ہو نرگس جو بے نوری پہ روتی ہو
بنا چینل تو ہو جائیں ہزاروں دیدہ ور پیدا

ایک اور جگہ اقبال نوجوانوں کو تعیشات سے بد دل کر کے پہاڑوں پر رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔لیکن ہمارا مشورہ تو یہ ہوگا

بنا اپنا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
نہ شاہیں بن کے دھکے کھا پہاڑوں کی چٹانوں پر

اسی لیے تو اقبال کے سارے شاہین اڑنے کی کوشش میں رہتے ہیں ۔پھر حضرت اقبال نے کسانوں کو فصل اچھی نہ ہونے کی صورت میں کھلیان ہی جلا دینے کا مشورہ دے ڈالا۔ہم ان سے اتفاق نہیں کرتے، بلکہ ہمارے خیال میں ،

جس کھیت سے دہقاں کو ملے سال کی روٹی
کیوں اس کے ہر اک خوشہ گندم کو جلا دیں

علامہ اقبال مغربی تہذیب سے سخت نالاں تھے اور اپنی ملت کو اقوام مغرب پر قیاس نہ کرنے کا درس دیتے گئے ۔مگر وقت نے کچھ اور ثابت کر دیا اور ہم مغرب کے مقابلے میں اتنا پیچھے رہ گئے کہ کسی دردمند کو یہ لکھنا پڑ گیا، کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
تُو کہتے تھے اوہ کہتے کچھ تاں خدا دا خوف کر

ادھر امجد اسلام امجد کے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پر برسیں تو محبوب کو بھلا دینے پر آ گئے۔پر ہم اس سلسلے میں کچھ جارحانہ خیالات رکھتے ہیں کہ

وہ ترے نصیب کی بارشیں یہاں میری چھت پہ برس گئیں
وہ تو کب کی تجھ کو بھلا چکی، میری بات سن تُو بھی بھول جا

جب ،،آتش،، جوان تھے تو محبوب کو گُل کے روبرو کرنے کی حسرت رکھتے تھے۔مگر ہم نے اپنے دور میں کچھ اور دیکھا اور چاہا جیسے

گزر گئی ہے سیاست پہ گفتگو کرتے
بسر ہوئی ہے وطن کو بے آبرو کرتے

فراز اگرچہ جہاندیدہ اور زیرک شاعر تھے مگر سادگی دیکھیے کہ تکلف کو اخلاص سمجھتے رہے، لیکن ہم تکلف کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ

CamScanner

ہم تکلف کو سراسر ہی سمجھتے ہیں فراڈ
دوست کیوں ہو سکے ہر ہاتھ ملانے والا

شیخ سعدیؒ جوانوں کو جوانی میں توبہ کرنے کی ترغیب دیتے رہے۔ مگر جوان عین فطرت پر زندگی کرتے گئے۔ اسی لیے ہم حقیقت پسندانہ رائے رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ

وقتِ پیری توبہ کردن شیوہء ہر آدمی
در جوانی ہر کس و ناکس شوُد فتنہ شعار

ماضی میں جذبات ملیہ سے سرشار بزرگ دنیا سے جاتے وقت نئی نسل کو یوں کہہ کر رخصت ہوتے تھے۔

ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کے
اس ملک کو رکھنا میرے بچو سنبھال کے

مگر وطنِ عزیز میں ہم نے جو اپنی زندگی میں دیکھا، سمجھا اور جانا، فقط یہی تھا کہ

ہم تو چلے طوفان میں کشتی کو ڈال کے
کوئی بھلا دکھائے بھنور سے نکال کے

میر تقی میر زندگی کی بے ثباتی سے خائف تھے اور آفاق کی منزل سے سامان لٹا کر گزرنے کے قائل تھے۔ پر آج کے طاغوتی دور میں لوگ ان باتوں سے نہیں ڈرتے۔ آج کا دور ساحلوں اور قمروں کا دور ہے اور اس شعر کو کسی نے خوب بدلا ہے کہ۔

طاغوت کی منزل سے گیا کون سلامت
سامان لُٹا ،،رات،، میں یاں ہر قمری کا

بہت سے شعراء اور ان کے تخیلات سے ہم نے اختلاف کیا مگر آخر میں آتش کے اس شعر سے اختلاف نہ کرنے کا اعلان کرتے ہیں جس میں وہ ،،عندلیب،، کو مل بیٹھ کر آہ زاریاں کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ لمحہ موجود کی مہنگائی کے تناظر میں بس ایک لفظ کی تبدیلی سے ان کے تخیل سے اتفاق کرتے ہیں،،

آ، عندلیب مل کے کریں آہ زاریاں
تُو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے بل

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر/لاہور

شر سے بھاگو مثلِ یوسف رُخ کو اپنے موڑ کر
چاہے آئے اک زلیخا پیچھے پیچھے دوڑ کر
عفت و پاکیزگی کی رہ پہ رہنا گامزن
مت بھٹک جانا کبھی دامن حیا کا چھوڑ کر
خوشنما کر کے دکھاتا ہے گنہ ابلیس سب
مت نکلنا تم کبھی رب کی حدوں کو توڑ کر
چاہتے ہو تم اگر منزل فلاح و فوز کی
رب سے ڈرنا، دین سے رکھنا تعلق جوڑ کر
مت کرو اصرار عصیاں پہ وگرنہ الحذر
زلزلہ رکھ دے گا پوری قوم کو جھنجھوڑ کر
کام آنا خلق کے لاریب ہے خیر العمل
رہ یہی چلتے رہو انساں سے ناتا جوڑ کر
وقت ہے کر لو سفر کی جیتے جی تیاریاں
جانے کب جانا پڑے دنیائے فانی چھوڑ کر
قافلہ ملت کا نکلے گردشوں سے کس طرح؟
آؤ اب سوچو ذرا اپنے سروں کو جوڑ کر
ہو ضرورت ایک تسمہ بھی تو رب سے مانگنا
ہے وہی منعم حقیقی سارا عالم چھوڑ کر
ربن کہے میری دُعائیں ہو گئیں اختر قبول
اور میں بیٹھا رہا لفظوں کے موتی جوڑ کر

عقیل شاقی/لاہور

چاند ہوتے چاندنی کو ڈھونڈنے نکلا ہوں میں
خشک سالی میں نمی کو ڈھونڈنے نکلا ہوں میں
جس گھڑی میں نے چھوا تھا اُس کے نازک لمس کو
اُس محبت کی گھڑی کو ڈھونڈنے نکلا ہوں میں
یہ مری دیوانگی ہے یا کہ پاگل پن کوئی
دُشمنوں میں دوستی کو ڈھونڈنے نکلا ہوں میں
جو اُترتی ہے دلوں میں اک ہی پل میں ساتھیو!
اس طرح کی شاعری کو ڈھونڈنے نکلا ہوں میں
زندگی کے چار دن جن میں سکوں سے رہ سکوں
ایسی ہی اک جھونپڑی کو ڈھونڈنے نکلا ہوں میں
گو کہ تاریکی کھڑی ہے راستہ روکے ہوئے
پھر بھی شاقی روشنی کو ڈھونڈنے نکلا ہوں میں

آصف ثاقب/بوئی ہزارہ

امن کی خاطر ملاقاتیں بھی کیں
رات بھر ہم نے مناجاتیں بھی کیں
ہم نے ہمت سے گزاری زندگی
آنکھوں آنکھوں میں کئی راتیں بھی کیں
اپنے رونے کا اجر پایا بہت
شہر کی گلیوں میں برساتیں بھی کیں
بازیاں کھیلیں قرینے سے جو ہم
جیتنا تو شرط تھی ماتیں بھی کیں
جب محبت میں مسافت کام تھا
ہم مسافر کی مداراتیں بھی کیں
احتیاطاً چوک میں بیٹھے رہے
گاؤں کے ہر بھائی سے باتیں بھی کیں
یوں تو ثاقب پاک بازی میں کٹی
جب ضرورت پڑ گئی گھاتیں بھی کیں

ڈاکٹر شمیم آزر/امریکہ

خواب میں اور خواہشوں میں رابطہ ہوتا تو ہے
خواب کو لیکن کسی دن ٹوٹنا ہوتا تو ہے
درد کی بازی کوئی ہارا کسی نے جیت لی
عشق کے ہر کھیل میں یہ سلسلہ ہوتا تو ہے
بھول پاتا ہے کہاں کوئی کسی کو عمر بھر
دل کے طاقوں میں دیا اک جل رہا ہوتا تو ہے
سننے والا بے سبب پاگل نہیں ہوتا کبھی
دھڑکنوں نے دل کی دل سے کچھ کہا ہوتا تو ہے
کوئی خود ہی لوٹنا چاہے نہیں تو کیا کریں
ہر سفر میں واپسی کا راستہ ہوتا تو ہے
اس لیے ہر دور میں زندہ رہی فرعونیت
سینکڑوں لوگوں کا آخر سر جھکا ہوتا تو ہے
حاکمانِ شہر جاہل ہوں تو آزر کیا کریں
وقت کی دیوار پر سب کچھ لکھا ہوتا تو ہے

یہ کتاب ہے باقی تمام تصویریں

پروفیسر نور کمال شاہ

کمرے کے اندر پراسراری خاموشی چھا گئی تھی۔ جانے کون سا وقت ہو رہا تھا، اندھیرا رفتہ رفتہ بڑھنے لگا تھا اور سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہو چکا تھا۔ جلتی ہوئی انگیٹھی میں آگ سرد ہونے کے قریب تھی۔ کمرے کے کاغذی پردوں سے ہلکی ہلکی سرسراہٹ کی آوازیں اٹھ رہی تھیں جو وہاں پر طاری طلسمی سکوت میں عجب طرح کا سحر انگیز تاثر پیدا کر رہی تھی۔ دروازے اور روشندان کی درزوں میں سے مدھم سی روشنی اندر داخل ہو رہی تھی۔ ایک پرانی وضع کا لیمپ جس کی روشنی کو ایک طرف محدود کرنے کی خاطر کاغذ کی اوٹ کھڑی کر دی گئی تھی، جل رہا تھا۔ یہ ایک پراسرار سا کمرہ تھا جو ہر طرح کی نئی و پرانی، کارآمد و نیم بے کار کتابوں سے سرتاسر بھرا ہوا تھا۔ کمرے کی ہر شے کتابی ہی تھی، کتابی دروازے، کتابی فرش، کتابی پردے اور کتابی فرنیچر۔ کمرے میں ایک بزرگ اپنے چار مریدوں کے ساتھ جلوہ فرما تھے۔ سامنے انگیٹھی میں ہلکی ہلکی آگ جل رہی تھی جس سے سردی کی شدت میں تھوڑی کمی واقع ہو رہی تھی۔ اکھڑے فرش پر ضخیم کتابیں جوڑ کر حلقے کی صورت میں نشستیں ترتیب دی گئی تھیں جن پر یہ پانچوں افراد تشریف فرما تھے۔ کتابی کرسی پر بیٹھے بزرگ کسی گہری سوچ میں غرق سرخ مخمور آنکھوں سے بجھتی آگ کو تک رہے تھے۔ کاغذی دسترخوان پر سجے کچھ موسمی پھل قریب ہی رکھے تھے۔ اردگرد لاتعداد سالم اور پھٹی پرانی کتابیں بھی موجود تھیں۔ پراسرار خاموشی کے بیچ اچانک بزرگ کی جلالی نظریں اٹھیں اور اوپر طاق میں ڈھیر کتابوں کی جانب مرکوز ہو گئیں۔ پاس بیٹھے اشارے کے منتظر مریدوں میں سے ایک نے فوراً اٹھ کر دو تین موٹی کتابیں اوپر تلے جوڑ کر رکھیں اور ان پر چڑھ کر نیلے رنگ کی ایک بھاری کتاب طاق سے اتار کر مرشد کے پاس لا کر رکھ دی۔ بزرگ نے کتاب کھول کر ایک اچٹتی سی نظر تحریر پر ڈالی اور پھر اس میں سے کچھ صفحے پھاڑ کر آگ میں پھینک دیئے۔ کاغذ جلنے لگے اور کمرے میں نیلے رنگ کی روحانی روشنی پھیل گئی۔ مریدوں نے حق ہو کا نعرہ بلند کیا۔ بزرگ نے مزید کچھ ورق الگ کر کے آگ میں ڈال دیئے؛ روشنی اور تپش میں اضافہ ہو گیا۔

پہلا مرید: پیرومرشد! آج پھر انہوں نے کسی دکان میں کتابیں پکڑ لی ہیں۔ کہہ رہے ہیں یہ ذخیرہ کیوں جمع ہے، شاید چوری کے ہیں؛ پکڑ کر لے گئے ہیں دکاندار کو۔

بزرگ: نادان ہیں یہ لوگ۔ یہ سمجھتے ہیں اس طرح کر کے لوگوں کو کتابوں سے دور کیا جا سکتا ہے مگر ایسا ممکن ہی نہیں۔ یہ ان کا غلط گمان ہے۔ جانتے نہیں ہیں اس قوم کو۔

دوسرا مرید: حضور! یہ لوگ تو پیچھے ہی پڑ گئے ہیں کتابوں کے؛ خدا جانے کیا ہو گا ان کا۔

بزرگ: یہ جانتے نہیں ہیں۔ ہم کتابوں میں بسنے والے لوگ ہیں؛ کتابیں ہماری زندگی ہیں؛ کتابیں ہی ہمارا اوڑھنا اور بچھونا ہیں۔ ہمیں کتابوں سے دور کرنے کا ان کا خواب ہمیشہ خواب ہی رہے گا جو کبھی پورا نہیں ہو سکے گا۔

پہلا مرید: پیرومرشد! ہمارے ہاں کتاب کا مستقبل کیا ہو گا اب؟

سنجیدہ ہو کے بولے" بڑا ہی بھیانک۔ بہت ہی تکلیف دہ؛ کتابوں کے لحاظ سے ہمارا ماضی تابناک اور حال عبرت ناک رہا ہے چنانچہ مستقبل دردناک ہی متوقع ہے۔ ماضی میں ہمارے علمی و سائنسی کارنامے کتابوں کی صورت میں یورپ منتقل ہو گئے۔ حملہ آور ہماری خودداری، حمیت اور جوانمردی کے ساتھ ساتھ ہماری قیمتی کتابیں بھی چھین کر لے گئے؛ ہمیں بے کتاب کر کے چھوڑ گئے۔ بحیثیت قوم وہ غم ہم آج تک بھول نہیں پائے۔ جب سے لے کر اب تک ہم ان ہی کتابوں کا ماتم کئے جا رہے ہیں۔ ان ہی کتابوں کے بل بوتے پر مغرب علوم و فنون کا وارث بن بیٹھا اور ہم اپنے بزرگوں کے علمی کارنامے اور مغربیوں کے ڈاکے کو فخریہ بیان کر کر کے خود کو لائق جانشین ثابت کرنے میں مصروف و مشغول ہیں۔ حضرت اقبال مرحوم نے لندن ہی کی ایک لائبریری میں کتابوں کے بیچ کھڑے ہو کر انگریزوں کو غیرت دلاتے ہوئے فرمایا تھا:

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

"کیا کتابوں کے بغیر ہم واقعی ادھورے اور نامکمل ہیں؟" تیسرے مرید نے فکرمندی سے پوچھا تو بزرگ رسان سے بولے؛

"کتابیں خود عمل نہیں فقط عمل کا راستہ دکھاتی ہیں۔ کتابوں کے ذریعے مسائل کا حل ممکن ہوتا تو آج کتابوں کی بجائے ہم غلے و اناج میں خودکفیل ہو چکے ہوتے۔ کتاب نے ہمیں بارود بنانے کا طریقہ تو سکھا دیا مگر بارود کو بے اثر کرنے کا کوئی نسخہ ہمیں نہ دے سکے۔ عالمی تباہی کے لئے ایٹم بم کا علم تو کتابوں نے دے دیا مگر یہ نہ سمجھا سکے کہ چلے ہوئے ایٹم بم کو بے اثر کیسے کیا جائے اور بم کے پھٹنے کے بعد اس کی تباہی سے بچیں کیسے۔ چنانچہ ان

CS CamScanner

ہی عیوب وعوارض کو دیکھتے ہوئے اب ہمارے ہاں قوم اور کتاب کو ایک دوسرے سے فاصلے پر رکھنے کی مربوط کوششیں شروع ہو چکی ہیں جو کہ کافی حد تک بارآور بھی ثابت ہو چکی ہیں- قوم بھی بھرپور ساتھ دے رہی ہے- بڑا مسئلہ طالب علموں کا تھا جن کا پورا واسطہ ہی کتابوں سے ہوتا ہے، شکر ہے ان کے ہاتھوں میں لیپ ٹاپ، کمپیوٹرز اور موبائل فون تھما کر کتاب سے نجات دلا دی گئی ہے''-

''مطلب زہر تو بنالیا گیا مگر تریاق کی جانب کسی نے کوئی توجہ ہی نہیں دی''- تیسرے مرید نے تفکرانہ انداز میں پوچھا-

بزرگ نے مرید کی رائے کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی: ''ہم پڑھائی اور مطالعے کے دور سے اب بہت آگے بڑھ چکے ہیں- جتنا پڑھنا تھا ہم پڑھ چکے اور جتنا سیکھنا تھا سیکھ چکے- اب ہمارا سارا زور حاصل شدہ علم کو ٹھکانے لگانے پر صرف ہو رہا ہے- ہم کتابوں کے زمانے سے نکل آئے ہیں جبھی تو ہمارے ایک زیرک شاعر بہت پہلے ہی معاملے کو بھانپ چکے تھے:

کاغذ کی یہ مہک یہ مزہ ٹوٹنے کو ہے
یہ آخری صدی ہے کتابوں سے عشق کی

شہر کے عالیشان مارکیٹوں میں واقع کتابوں کی پرشکوہ دکانیں بند ہو چکی ہیں یا کسی پرانی کھنڈر نما گودام سائز کی بدنما اور گرد سے اٹے دکانوں میں منتقل ہو چکی ہیں- ان کی جگہ اب زرق برق سجے سجائے فیشن اور فینسی ملبوسات کی دکانیں لے چکی ہیں جو مارکیٹ کے حسن و زیبائی کے ساتھ ساتھ شہر کی دلآویزی میں بھی اضافہ کر رہی ہیں- خوبصورت اور سجے سجائے شوکیس اب جوتوں کے لئے مخصوص ہیں- آسان تر رسائی کے شوق میں ہماری کتابیں الماریوں سے اتر کر فٹ پاتھ پہ آچکی ہیں- لاہور کی انارکلی میں نکلیں یا پشاور کے قصہ خوانی میں؛ مردان کے بکٹ گنج میں جائیں یا کراچی کے سپر مارکیٹ میں، ہر جگہ آپ کو زمین پر بھی کتابوں کی لمبی قطاریں تاحد نظر پھیلی ں نظر آئیں گی جو کسی بھولے بسرے خریدار کے چشم طلب گار کی منتظر رہتی ہیں- اہل علم یہاں فقط تماشا دیکھنے اور اہل ذوق اپنی اپنی مرضی کی کتابیں چرانے بڑی تعداد میں پہنچ جاتے ہیں؛ اور آخر میں دونوں اپنی اپنی کامیابی پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے ہوتے - کتابوں کی چوری ہمارے ہاں قبیح فعل کبھی بھی نہیں رہا- آخر منٹو جیسے بڑے قلم کار بھی تو ریلوے سٹیشن کے سٹال سے کتابیں چرا کر ہی اتنے بڑے افسانہ نگار بن بیٹھے تھے، موصوف آخری عمر میں یہی کتابیں پڑھا کرتے تھے-

پہلا مرید: انتہائی قابل افسوس! کتابوں کا ایسا حشر ہوگا کبھی سوچا بھی نہ تھا!!!

بزرگ ہلکے سے مسکرائے، اور دائیں ہاتھ سے سر پہ رکھی ٹوپی اتار کر بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے سر کو دیوانہ وار کھجایا اور اسے پھر سے اسی ٹوپی سے ڈھانپتے ہوئے بولے:

''ہمارے پاس کتابوں کا قابل فخر ذخیرہ جمع ہو چکا ہے، جنہیں مکانات کے کونے کھدروں سے نکال کر سڑکوں پہ لایا جا چکا ہے- اپنی طبع زاد کتابوں، تحفتاً اور تعریفی تبصروں کے لئے بھیجی گئی کتابوں اور مارکیٹ سے بغل میں دبا کر لائی گئی کتابوں کا یہ وسیع ذخیرہ جن کو کبھی کھولنے تک کی نوبت بھی نہیں آئی، اب ہمارے لئے بوجھ بن چکا ہے- کتابوں کی ردی کھلے بندوں بیچی اور خریدی جا رہی ہے- کتابی ورق ہاتھ پونچھنے، گاڑیوں اور گھروں کے شیشے صاف کرنے اور جوتے چمکانے کے لئے استعمال ہو رہے ہیں؛ سنا ہے شیریں اپنے محبوب فرہاد کے لئے پھول کتاب کے بیچ میں چھپا کر ہی بھیجا کرتی تھیں- صفحوں کے بیچ مرجھائی ہوئی پھول کی پتیاں عشق و محبت کے کڑے امتحان اور ناکامی و نامرادی کی داستانیں سناتی نظر آتی ہیں- چیخ چیخ کر پکارا جا رہا ہے:

قبروں میں نہیں ہم کو کتابوں میں اتارو
ہم لوگ محبت کی کہانی میں مرے ہیں

چوتھا مرید جو پہلی بار گفتگو میں شریک ہو رہا تھا بولا ''مطلب یہ کہ ہمارے ہاں بجائے تحفہ بننے کے، کتاب کو بٹوہ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اور اس کے ذریعے عشق کی تکمیل ممکن بنانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں''-

بزرگ نے سلسلہ کلام جاری رکھا ''اس حقیقت کے باوجود کہ کتاب اب ہماری اور ہمارے طلباء کی ضرورت نہیں رہی مگر امتحانی ہالوں میں اس کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی ہے؛ چنانچہ ان مقامات میں اس کا استعمال عام ہے- کتاب کو ورق ورق پھاڑ کر مختلف جیبوں میں بھر لیا جاتا ہے اور بطور امتحانی معاون استعمال کیا جاتا ہے؛ جہاں کوئی مشکل سوال سامنے آیا جھٹ سے جیبیں ٹٹول کر متعلقہ معاون پرچی نکالی اور مسئلہ حل کر لیا- چنانچہ امتحانات کے دنوں میں کتابوں کا قتل عام ہمارے ہاں عام ہے''-

ورق کٹتے اور کاغذ جلتے رہے؛ حدت میں اضافہ ہوتا رہا- پیرومرشد کا اٹھا ہوا ہاتھ شائد اختتام مجلس کا اشارہ تھا- سرشار مرید برابر جھومتے رہے؛ سر ہلتے اور بدن مسلسل تھرکتے رہے- بزرگ نے اپنی لاٹھی اٹھائی، دوسرے مرید کے پیروں سے اپنے جوتے اتروائے اور خاموشی سے بغلی دروازے کی جانب بڑھے------!!!!

ساتواں درویش

سیّد تحسین گیلانی/ساہیوال

ساتواں درویش روتے ہوئے قصہ سُنا رہا تھا، اونچے ٹیلے پر کھڑے وہ مست الست اونچی آواز میں شجر وحجر نباتات وجمادات اور جن وانس سے مخاطب تھا۔

اے جن وانس سُنو !!!!

"یہ قصہ صدیوں پہلے کا ہے وقت بدل گیا لیکن شاید وقت نہیں بدلا، وہ تھا وہ اب نہیں ہے لیکن وہ جو نہیں رہا وہ اب بھی کہیں ہے۔۔۔۔۔"

"اُس کے افکار اُجالوں کے ہم نشیں تھے، کیوں نہ ہوتے اُس کی سوچ کے کنول تاروں کی آغوش میں کِھلے تھے۔یہی وجہ ہے کہ اندھیروں سے بغاوت اُس کی فطرت میں رقم تھی۔وقت کے تخت نشیں نے جب اُسے سمجھوتے کی پیشکش کی تو وہ رخ موڑ کر اپنے چراغوں کو صدا دینے لگا۔وقت کی آزمائش گاہ میں اُس کی پشت پر بڑا بوجھ لاد دیا گیا تھا۔وہ سورج کو اٹھا کر چل پڑا جس کی حدت نے اس کی ہڈیوں کو گلانا شروع کر دیا تھا لیکن اُس نے اِس مہم کے لیے خود کو تیار کر رکھا تھا اُسے علم تھا کہ بستی کے دربان ہی بستی کو لوٹ رہے ہیں۔اُس نے روشنی کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا لیکن مامورین نے قسم کھا رکھی تھی کہ اس بستی میں ایک بھی چراغ جلتا نہ چھوڑیں گے۔انھیں تو بس سرخ محل کی تابندگی وجاددانی عزیز تھی۔

قصوروار کون تھا؟

اصل مسئلہ کیا تھا؟ کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔

صدیوں سے خوف کے آسیب نے بستی میں موجود ہر فرد کے ذہن کو مفلوج کر رکھا تھا۔

کیا ہی عجیب منظر تھا۔جب دربانوں نے ایک ستارے کو مصلوب کیا اور خود بستی کے نگران ہو گئے۔ لوگ چیونٹیاں بن کر رینگنے لگے۔گدھوں کو پر لگ گئے ،سانپ خزانوں پر لوٹنے لگے، ہرا بھرا گلشن جس کی تعظیم میں ایک دنیا قصیدہ خواں تھی دیکھتے ہی دیکھتے باغیوں اور موت کے سوداگروں کی آماجگاہ بن گیا۔ گِدھ پوری بستی پر منڈلانے لگے۔محافظین کے قصر سرخ میناروں میں بدل گئے۔ ان کے برج اتنے اونچے ہو گئے کہ وہ ہواؤں میں اڑنے لگے۔

کہنے والا چپ تھا۔ جسے چپ ہونا چاہیے تھا وہ لبوں سے راج کا جام لگائے، سدھ بدھ کھوئے، کسی خواب کی بانہوں میں مدہوش تھا۔بستی کا ہر شجر خوف میں مبتلا تھا کیونکہ موسم کا ہر پھل فضا میں معلق ہو گیا تھا۔

ہر سُو مشہور کر دیا گیا تھا کہ منشور اور دستور پر اَن دیکھی آدم خور بلاؤں کا قبضہ ہو گیا ہے۔موجود کو معدوم اور حاضر کو غائب کرنے والا منتر دانہ ہر وقت ان کی بند مٹھی کو گرمائے رکھتا ہے۔ایسا ہی ہو رہا تھا۔ دربانوں نے ایک بندر کو بستی کا سردار بنا دیا اور خود منہ بولی قیمت پر ڈگڈگی خرید کر سرخ مینار کی چوٹی پر جا بیٹھے جہاں وہ رقص وسرور کی محفلیں برپا کرنے اور ڈگڈگی بجا کر قہقہے لگانے میں مگن ہو گئے۔روشنی کی ترسیل چاہنے والا مسافر جو سفید رنگ کے ہالے میں رہتا تھا۔ اس نے گھٹی میں حق کا شہد چکھا تھا اس لیے کڑوے ذائقوں سے نا آشنا تھا۔یہ وہی تھا جو اس بستی کا من چاہا تھا جس کے چاہنے والوں نے اُس کے چراغوں کو لہو سے جلا کر اس کے ساتھ اندھیرے مٹانے کی قسم کھائی تھی۔اُس کے نام نام کا نعرہ بلند ہوا تو جنگل میں چیختے گیدڑوں کا شور آوازوں کو نگلنے لگا اور طاقت کے آسیب نے بستی کو چاٹنا شروع کر دیا۔صحیفوں کی حرمت پامال ہوئی اور تقدس کی دھجیاں اڑائی جانے لگیں۔قانون اب بھی رائج تھا مگر کچھ ایسا کہ قانون شکن مقنن کہلا رہے تھے۔جب وہ کوچہ و بازار میں چابک لہرا کر قانون کو ہراساں کرنے میں مصروف تھے تب جبر واستبداد کے کالے بادلوں نے بستی پر مسلسل برسنا شروع کر دیا تھا۔ہر طرف کالا سیال مادہ بہتا تھا جو انسان اور انسانیت کی بے حرمتی کی بنیاد تھا ۔جھوٹ راج کر رہا تھا۔بندگانِ خدا کا ایک لشکر، یزیدِ وقت کے خلاف کھڑا ہوا چاہتا تھا لیکن وہ کوفی مزاج جو زَر وجواہر سے جھولیاں بھر چکے تھے وہ بستی کی عزت نیلام کرنے میں دشمنوں کا بھرپور ساتھ دے رہے تھے۔

ایک دن کھلے میدان میں انھوں نے سفید رنگ کو زنجیر بکف کر دیا اور فرعونی کوڑے مارنے کا حکم صادر کیا۔میدان میں جشن کا سا سماں تھا تماشا دیکھنے وہی طمع کے اسیر آئے جنھوں نے مٹھیوں میں درہم و دینار چھپا رکھے تھے۔سب دائروں میں بیٹھ کر سفید رنگ کے جسم کے چیتھڑے اڑتے دیکھ رہے تھے۔ بہتا لہو "انا الحق" تحریر کر رہا تھا۔

اتنے میں کسی نے سفید رنگ کے کانوں میں کلام کیا۔

یا صاحب الصبر !!!

"آپ کہیں تو اِن سرخ میناروں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں؟

آسمان سے ہم کلام اس کی بولتی نگاہوں نے زاویہ بدل کر آواز کی سمت دیکھا۔

"حکم کیجیے !!! ابھی ان محل میناروں کے باسیوں کو تہس نہس کر دیتے ہیں۔"

اشارہ ہوا۔

نہیں !!!

"یہ روشنی اور اندھیرے کی جنگ ہے۔

جب ہوائیں چراغوں کی محافظ ہو جائیں تو اندھیروں کو اپنی موت آپ مرنا پڑتا ہے۔موت اُن کی مجبوری بن جاتی ہے۔جب تک نیل کے پانی میں حق کا رنگ ہے ڈوبنا ہر فرعون کا مقدر ہے ۔"

مجھے تلوار کا وار نہیں دعا کا ہتھیار چاہیے۔"

وہ ایک پل کے لیے خاموش ہوا اور پھر اس نے کاندھوں پہ لدا سورج ہتھیلی پہ بلند کرتے ہوئے کہا

"تم دیکھنا ہم یہ جنگ صبر کی پاسبانی میں لڑتے

ہوئے فتح یاب ہوں گے، یہی سفید رنگ روشنی بن کر اس بستی کی رگوں میں دوڑے گا۔اندھیرا خود سے ڈر جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ رکا نہیں پھر سے سورج کاندھے پہ لاد کر چلنے لگا۔اس کے قدم اٹھاتے ہی آواز ایک بار پھر گونجی۔

"وہ بوجھ اٹھانے والا دیکھو۔ وہ جو سورج کو کاندھے پر لادے جارہا ہے وہ حق کے ہاتھوں پر بیعت کر چکا ہے۔۔۔۔

تم دیکھنا وہ سورج کو اپنے اندر حلول کرلے گا اور پھر روشنی اس کے اندر سے پھوٹے گی۔ سب سے کہہ دو روشنی کا دیوتا آنے والا ہے۔فکر وخیال کو انگارے بنا لیں۔ وہ انگارے جو کسی خوف کی راکھ تلے دبے پڑے ہیں ان دبے انگاروں کو مجتمع کریں اور سینہ سپر ہو جائیں اور اپنی بستی پر چھائے اس آسیب کو اپنے قلب وجگر کی آگ سے خاکستر کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔انھیں بھی بتاؤ، وہ جو بھاگ رہے ہیں ،ڈر رہے ہیں اور وہ جو تماشا دیکھ رہے ہیں وہ سب بھی اس آگ میں جلنے کے لیے تیار رہیں۔"

پھر مکمل خاموشی ہوگئی۔

خاموش آندھیاں چلنے لگیں۔ برق رتھ پر طوفان برپا ہوگیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے سفید رنگ کی بارش ہونے لگی قصر سرخ پر گولوں کی مانند سفید رنگ برسنے لگا۔قصر نابود ہوگیا۔۔۔

قصر میں بیٹھا فرعون چیخنے لگا۔آسیب بھی سفید رنگ کا لقمہ بن گیا اور آسمان پر روشنی کی ایک لکیر نمودار ہوئی۔۔۔

وہ جو سورج کو چبا چکا تھا وہ فلک پر نمودار ہوا اور اس نے نعرہ بلند کیا۔۔۔۔۔

انّ اللہ معَ الصّابرین۔

عامر بن علی/ جاپان

نفرتیں تو بڑھ گئی ہیں دوستی ملتی نہیں
اس نگر میں اب مُنا ہے عاشقی ملتی نہیں
میں نے دنیا بھر کی ہر اک کامیابی دیکھ لی
تجھ سے مل کر جو ملی تھی وہ خوشی ملتی نہیں
چھان کر صحرا جو دیکھا تب کہیں مجھ پر کھلا
ریت میں کھوئی کوئی شے قیمتی ملتی نہیں
اس کے چہرے کی دمک سے شہر میں تھی روشنی
اس قدر جو مہرباں ہو چاندنی ملتی نہیں
اور بھی دنیا میں کتنے خوبصورت لوگ ہیں
ہاں مگر جو اس میں ہے جادوگری ملتی نہیں
زرد پتے گر رہے ہیں جو خزاں کے خوف سے
پیڑ سے جو کٹ گرے تو زندگی ملتی نہیں
اس کی آنکھوں نے کہی جو بات مجھ کو یاد ہے
کاغذوں پہ جان ایسی شاعری ملتی نہیں

حرفِ دُعا

آج اچانک ایک پرانا البم کھولا
جس میں کچھ تصویریں تھیں
اور ایک پُرانا خط رکھا تھا
جس کے حرف سے سے لڑتے بکھر چکے تھے
پاس ہی اک تصویر میں اک وہ چہرا دیکھا
راج ہے جس کا اس دل پہ اس دن سے ہی
جب کالج میں پہلی بار تمہیں دیکھا تھا
اس موسم کی اک تصویر وہاں میری تھی
جس کو دیکھ کے غور سے میں نے آئینہ دیکھا
تیرا نقش تو دل میں آج بھی ویسا ہی ہے
لیکن وقت نے میرا چہرہ بدل دیا ہے
دیکھ کے آئینہ میں نے سوچا
ممکن ہے تیرا بھی چہرہ بدل گیا ہو؟
اور اس خوف میں مَیں کل شب کو
ایک دعا ہر روز جو کرتا ہوں ملنے کی
رات دعا وہ
خدا سے کرنا بھول گیا!!

آفتاب شاہ/ سیالکوٹ

تم حسن کی حدت ہو کرشمہ ہو جدا ہو
افلاک سے اُترا ہوا تحفہ ہو ، عطا ہو
غازے کا تبسم ہو کہ تتلی کی قبا ہو
تم قوس میں ڈھلتی ہوئی رنگوں کی عبا ہو
تم حور ہو فردوس کی یا عکس سبا ہو
تم چاند کا ہالہ ہو کہ آہو کی ادا ہو
تم ساز ہو سنگیت کا اور درس وفا ہو
تم ربط ہو قدرت کا کوئی راز خدا ہو
جو سوچ کی راتوں میں چلی آتی ہے چھپ کے
وہ دن کا اُجالا ہو کہ وہ بادِ صبا ہو
وہ جس کے تصور سے مہکتا ہوں میں دن رات
وہ پھول ہو خوشبو کا کہ وہ رنگ حنا ہو
جس عکس سے آتی ہے صدا عشق کی مجھ کو
جگنو ہو وہ ہستی کا کہ بلبل کی نوا ہو
تم دھوپ سی نکھری ہوئی صد رنگ پری ہو
تم نُور کے سانچے میں ڈھلی رقص سبا ہو

لبنیٰ صفدر/ لاہور

ہر لفظ میں ہے نام تمہارا لکھا ہوا
شعروں میں ہے جو خوب سراپا لکھا ہوا
اس رات کی ردا کے کنارے کو دیکھ تو
لکھی ہوئی ہے دھوپ ، اُجالا لکھا ہوا
چلنا ہی صرف لکھا ہے میرے نصیب میں
منزل سے تھوڑا آگے ہے رستہ لکھا ہوا
رنگیں بہت ہے زندگی تیرا ہر اک ورق
لفظوں کے روپ میں ہے تماشا لکھا ہوا
یہ کیسے موڑ پر مجھے لائی ہے زندگی
آگے ہر ایک موڑ پہ ہے صحرا لکھا ہوا
تعبیر کرچیوں کی نہ اس کو بکھیر دے
آنکھوں میں میری کانچ سا سپنا لکھا ہوا

CamScanner

سماج

آسناتھ کنول

خارج کی دُنیا کا تو علم نہیں مگر اندر کی تنہائیاں عذاب اوڑھے بیٹھی تھیں۔کبھی کبھی کوئی ٹیس اپنا آپ دکھلا جاتی۔زبان پرحروف کالاوا اپنا ہی تن من بھسم کرتا رہا۔کسی کی تانگ کسی کی اُمید اور انتظار کیسے اِس دل کے خلا کو بھر سکتا ہے۔وہ خلا جو اُن محیط کائناتوں سے بھی بڑا تھا۔جس کی گہرائی تو بحرالکاہل سے بھی زیادہ تھی۔اور اُس کے قدم قدم پر کئی برمودا ٹرائی اینگل موجود تھے جو اپنی کشش سے اُس کو اپنی طرف کھینچتے تھے۔ روح کے بھاری جال پر لگی کتنی زنگ کی پرتیں پلکیں نہ اُٹھانے دیتیں۔اِک بوجھل پن پتلیوں پر براجمان ہوا رہتا۔ٹکڑوں میں بٹا ہوا دل بھلا کیسے سہہ پاتا۔کہ کیا ہوا تھا۔دل کسی ریل کی پٹڑی پر رکھا رہتا۔آنکھوں میں جمع کہرے کی دُھند پگھلتی تو ندیوں میں باڑ آجاتی۔سینے میں جدائی کے دیگچے اُبلتے اور شور مچاتے رہتے۔سینے میں اتنا بڑا خلا بھلا کیسے آباد ہوا تھا۔

اپنے ہی اندر لڑتے بھڑتے سوچتے کہ کہیں آنکھ ہی نہ لگ جاتی۔نیند آجاتی یا کوئی نیندوں کو آباد کرتا۔مگر یہ ممکن کہاں تھا۔عمر کے ناگ منہ کھولے نگلنے کو تیار رہتے ہیں۔سوچوں کے ندی نالوں کو پھلانگتا وہ خیالی چٹانوں پر ننگے پاؤں رواں دواں تھا۔لفظوں کی بُکل میں روح کو چھپائے وہ دُنیا کی کھوج پرکھ لیے،آنسوؤں کا پیالہ کٹورا ہتھیلیوں پر آگ گراتا،پاؤں کے چھالے سنبھالتا تھا۔عجیب سی کسی مجذوب کی دُھن تھی۔

کسی کی اور کیا تلاش تھی جو کہیں ٹک کر بیٹھنے نہ دیتی۔ سیاہ پہاڑوں کے سنگین دل ٹھوکریں اُچھالتے ہیں۔صحراؤں، ندی نالوں، سمندروں میں گوہر مقصود ڈھونڈتا وہ بلوچستان کے سیاہ سرد پہاڑوں میں تیز کٹیلی ہواؤں سے راستہ پوچھتا تھا۔ہوائیں جو اُس کے بدن کے آرپار اُترتی تھیں۔دشت جھالاوان کی ویرانی بھی اُس کے ارادوں کے آگے بند نہ بنا سکی تھی۔وہ بھاگتا رہا بھاگتا رہا۔اپنے ہی آپ سے بھاگنا بھی آسان نہیں۔احساس کے کنکر پتھر جینے نہیں دیتے۔ان کی چبھن ہی کاٹتی اور مار ڈالتی ہے۔

یونیورسٹی میں نام تو شہیر بلوچ تھا۔غریب ماں باپ نے اکلوتے بیٹے کو افسر بنانے کے خواب دیکھے تھے۔مگر شہیر بلوچ جو شیروان کے نام سے اپنی سرپھری طبعت کے باعث یونیورسٹی میں نہایت اکھڑ مزاج مشہور تھا۔سیدھے منہ بات کرنا وہ تب ہی بھول گیا تھا۔جب پہلی بار اِک ہمسائے نے بچوں کی لڑائی میں اِس بے گناہ کو جان بوجھ کر تھپڑ مارا تھا۔حالانکہ وہ صرف لڑائی دیکھ رہا تھا۔کسی سے بھی لڑا نہیں تھا۔مگر ہمسائے چچا کو ہمیشہ اُسے کے محنتی باپ کی محنت پر غصہ آیا رہتا۔وہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار یونہی کرتا رہتا کہ اگر اُسے موقع ملتا تو وہ ضرور اُنہیں زِک پہنچانے کی کوشش کرتا۔

ابھی بھی وہی ہوا تھا کہ اُس نے بے گناہ شہیر کو تھپڑ دے مارا۔وہ کافی دیر گال سہلاتا رہا۔یہ پہلا لمحہ تھا جب اِک زخم اُس کے دل پر لگا۔اِک نفرت اُس کے وجود میں جڑ پھیلانے لگی۔ناانصافی پر اِک آنسو نے اُس کی آنکھ کو نم کیا۔لڑنے والے بچے پھر کھیلنے لگ گئے۔مگر وہ دوبارہ نہ کھیل سکا۔ہمسائے کی نفرت کا درخت تناور ہوتا رہا۔وہ اکثر اُس کے باپ سے ذرا ذرا سی بات پر لڑ پڑتا۔نوبت مرنے مارنے تک آجاتی۔محلے والے بیچ بچاؤ کرا دیتے۔وہ تو چھوٹا تھا مگر ہر روز اِک نیا چرکہ، اِک نیا زخم اُس کے دل کو اُدھیڑنے لگتا۔اِک تڑپ، اِک ٹیس اُس کی روح کو جلاتی۔وقت گذرتا رہا۔وہ سکول سے کالج اور یونیورسٹی پہنچ گیا تھا۔ناانصافیوں کا اِک لامتناہی سلسلہ اُس کے وجود پر کالے ناگوں کی طرح شوکتا تو وہ بے قرار ہو جاتا۔کیا کرے۔!! کیا کرے!!

اُف!! سر تھام کر وہ گھنٹوں خود سے سوال کرتا۔کب تک آخر کب تک وہ اِس لاوے کو سنبھالے گا۔جو اُس کے وجود میں اُبلتا رہتا ہے۔کسی دن یہ آتش فشاں پھوٹ پڑا تو اِس دُنیا کو جلا کر راکھ کر دے گا۔شہیر اپنے تمام پروفیسرز کی بہت عزت کرتا اور ادب سے پیش آتا۔اُن کی باتوں کو غور سے سُنتا۔انگلش کے پروفیسر ساجد خان سے وہ خاص طور پر متاثر تھا۔چھ فٹ قد کے جوان، بے حد خوبصورت اور نہایت سُلجھے ہوئے۔ادب آداب کا خیال رکھنے والی شخصیت۔ساری یونیورسٹی میں وہ بہت مقبول تھے۔شہیر بلوچ اُن کا دل سے ادب کرتا۔خواتین بھی یونیورسٹی کا حصہ تھیں۔شہیر خود بھی لمبا جوان اور خوبصورت لڑکا تھا۔بہت سی لڑکیاں اُس کی طرف مائل ہوتیں۔مگر وہ اپنے خودساختہ غلاف سے کبھی باہر نہ آیا۔

ہونی کو کون روک سکتا ہے۔ساجد خان ذرا دیر سے کلاس میں آئے اور آ کر محبت کہ ماہیت اور اِس کے اثرات پر لیکچر دینے لگے۔مغرب میں محبت کا تصور اور مشرق کی سوچ پر گفتگو جاری تھی کہ اچانک ایک لڑکا اُٹھ کھڑا ہوا۔پروفیسر بند کرو یہ بکواس۔یہ تم نے کیا محبت محبت کی رٹ لگا رکھی ہے۔ہماری مائیں بہنیں بھی ساتھ بیٹھی ہیں۔اِس کے کتنے بُرے اثرات ہونگے۔

چلو ٹھیک ہے ہم کوئی اور بات کر لیتے ہیں۔اِس پر پھر کبھی بات کریں گے۔ابھی نصیر صاحب غصے میں ہیں۔پروفیسر دوبارہ اِس موضوع پر بات نہ ہو۔نصیر صاحب اگر ہم شاعری اور ادب کو پڑھیں تو ہم اِس میں سے محبت کو نہیں نکال سکتے۔محبت شاعری کا جزو اعظم ہے۔عشق کے بغیر غزل مکمل نہیں ہوتی۔ابھی الفاظ پروفیسر کے منہ میں ہی تھے کہ ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور پروفیسر کا سینہ چیرتی ہوئی گذر گئی۔سب ہکا بکا رہ گئے۔اِک سکوت ساری کلاس پر چھا گیا۔پروفیسر کی ایک لمبی ہائے نے طلبہ کو ہوش دلایا۔اِس سے پہلے کہ ساجد خان گر جاتے، شہیر نے بھاگ کر اُنہیں بازوؤں میں بھر لیا۔اُن کا سینہ تازہ سرخ خون سے بھر چکا تھا۔شہیر نے جلدی سے قمیض اُتاری اور ساجد خان کے سینے پر باندھ دی۔لڑکیاں چیختی چلاتی باہر بھاگ گئیں۔ لاَ فاناَ یونیورسٹی میں خبر پھیل گئی۔کسی کو گولی چلانے والے کا ہوش ہی نہیں تھا۔ایمبولینس آ گئی۔شہیر نے پروفیسر ساجد کو اپنے ہاتھوں پر اُٹھا رکھا تھا۔سٹریچر لایا گیا۔منٹوں میں پروفیسر ساجد کو ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔شہیر کی آنکھیں ضبط کے مارے لال انگارہ ہو رہی تھیں۔باقی سب اُس کے غصے کو دیکھ کر سہم گئے۔

CS CamScanner

تمام پروفیسرز، سٹاف، سٹوڈنٹس سب جمع تھے۔کس نے گولی چلائی؟ نصیر خان نے سر۔شہیر بولا۔اُس کی آواز میں آنسوؤں کی لرزش تھی۔آنسو بند توڑ دینا چاہتے تھے۔اب وہ کہاں ہے؟پولیس آفیسر جنید اصغر نے پوچھا۔وہ بھاگ گیا ہے۔کیسے!! پولیس آفیسر نے رُعب سے پوچھا۔کلاس پر سکتہ چھا گیا تھا۔ ہم سب پروفیسر کی طرف بھاگے۔وہ موقع پا کر فرار ہو گیا۔سر اُس کے ہاتھ میں گن تھی ہم اُسے کیسے پکڑتے۔ ایک لڑکی نے دُہائی دی۔

آپ بے فکر رہیں۔ہم اُسے ڈھونڈ لیں گے۔آپ سب اپنے بیانات قلمبند کروا دیں۔ضروری کارروائی کے بعد ڈی ایس پی جنید وہاں سے ہاسپٹل چلے گئے۔

پروفیسر ساجد مسلسل بے ہوش تھے۔گولی دل کے پاس سینے میں اُتری تھی۔وہ اپنے ہی خون میں ڈوب چکے تھے۔

ڈاکٹرز اُنہیں بچانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔آٹھ دس گھنٹے کی مشقت اور کوشش کے باوجود جوان جہان قارن کوالیفائڈ ڈاکٹر ساجد خان زندگی کی بازی ہار گئے۔شہیر کا دُکھ ویسا ہی تھا جیسا ہمسائے کے پہلے تھپڑ کا۔جو اُس کا دل چیر گیا تھا۔اِک گہری چُپ نے اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔اپنے ہی وجود میں ویران اور تنہا کھڑا تھا۔کیسا معاشرہ تھا۔کیا ہم جانور ہیں یا انسان۔

محبت کی بات کرنے والے کو دن دیہاڑے گولی ماردی جاتی ہے۔کہ وہ اچھی بات کیوں کرتا ہے۔بیمار اور ذہنی اور نفسیاتی مریض پستول لیے گھومتے ہیں۔وہ کالجوں یونیورسٹیوں میں آ جاتے ہیں۔دندناتے پھرتے ہیں۔جو ہر قابل کا خون کر دیتے ہیں۔بے گناہوں کو شہید کرتے ہیں۔کیا میں اِس معاشرے سے بدلہ لوں۔ایک سے، دو سے، آخر کتنے لوگوں سے۔کہ یہاں سب کے سب کسی آگ میں جلتے ہیں۔

اور شہیر جیسے حساس لوگوں کی روحیں انگاروں پر لوٹتی ہیں۔شہیر غم زدہ تھا۔جھالاوان کے دشت سے زیادہ بڑا غم۔بلوچستان کے سرد پتھریلے سنگین پہاڑوں سے زیادہ بڑا غم۔صحرائے تھر کے جلتے ہوئے ٹیلوں سے بڑا دُکھ۔آنکھیں دھندلی ہوتی رہیں۔دل پر چٹانوں کا بوجھ بڑھتا رہا۔پڑھائی چھوٹ گئی تھی۔ہاسٹل کے دوستوں نے اُسے سمجھانے کی بہت کوشش کی۔مگر وہ اُن کے سمجھانے کی حد سے بہت آگے نکل چکا تھا۔وہ اپنی آنکھوں کے منجمد جزیروں کو لے کر اپنی آگ میں سُلگتا۔

پھر اِک فیصلے نے اُس کی زندگی بدل دی۔میں اِس ناانصافی کا بدلہ خود لوں گا۔اُن سب سے جو ناانصافی کو جنم دیتے ہیں۔اُس ہمسائے سے جس نے پہلا تھپڑ مارا۔اُس نائی سے جس نے اُس کے بال کاٹنے سے انکار کیا اور اُس کی عزت نفس کو مجروح کیا۔اُس آفسر کو جو اُس کے نہایت محنتی باپ کو روز بے عزت کرتا اور کام سے نکال دینے کی دھمکی دیتا۔اُس بیگم صاحبہ سے جو اُس کی ماں کو اُس کے کام کا معاوضہ نہیں دیتی تھی بلکہ اکثر اُس کے پیسے روک لیتی۔اُس ٹیچر سے جو سبق یاد نہ کرنے کی پاداش میں اُسے گھنٹوں کھڑا رکھتا اور ڈنڈوں سے مارتا۔

ناانصافی قدم قدم پر بکھری تھی۔ وہ کیا کرے۔بچپن سے اب تک ناانصافی کی ایک لمبی فہرست تھی۔رشتہ داروں، دوستوں، ہمسایوں، تعلق داروں، محبت کے نام پر دھوکہ دینے والوں سے وہ بھر چکا تھا۔سب کی بے ایمانی سے، فریب سے، مکر سے، جھوٹ سے، رشوت سے، ناجائز کاروباروں سے اور اب ایک بے گناہ پروفیسر۔ اِس قوم کے ایک پُر نور دماغ کو جہالت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ یہ آخر کب تک ہوتا رہے گا۔

پھر فیصلہ ہو گیا۔مفرور مجرم کو ڈھونڈ کر سزا دینے کا۔ یونیورسٹی چھوڑ کر وہ نصیر کی تلاش میں شہروں شہروں کی خاک چھاننے لگا۔ جب اُسے پتہ چلا کہ وہ بلوچستان کے سنگلاخ پہاڑ اور سخت موسموں میں جا چھپا ہے تو شہیر بلاچ بھی اُس کے پیچھے اُن پہاڑوں میں چلا آیا۔اب اُس کے پاس گن بھی تھی اور خنجر بھی۔زندگی کا مقصد یک دم ہی تبدیل ہو گیا تھا۔اتنا پڑھ لکھ کر بھی اگر جہالت نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑنا تو بہتر ہے اب اِس زبان میں بات کی جائے جو وہ سمجھتے ہیں۔

زندگی اتنی غنیمت تو نہیں جس کے لیے
عہد کم ظرف کی ہر بات گوارا کر لیں

کسی نے اُسے کوئٹہ میں ایک خبری سے ملنے کا کہا۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کوئٹہ پہنچ گیا تھا۔خبری شیر دل سے ملاقات ہو گئی۔تاڑ کے پیڑ کی طرح پتلا لمبا سا آدمی جس کی چھدری داڑی اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں نے اُسے عجیب خوفناک سا روپ دے رکھا تھا۔پہلی نظر میں وہ شہیر کو اچھا تو نہیں لگا تھا مگر اُس نیولے جیسے آدمی سے اُسے کام تھا۔ دیکھو شہیر بلوچ تم ایک پڑھے لکھے سٹوڈنٹ بندے ہو۔تمہارا اِس قتل و غارت سے کیا واسطہ۔ تم ہم سے کچھ پیسے طے کرو، حلیہ بتاؤ ہم خود اُس کو تلاش کر کے مار دیں گے۔تم اُس کے گندے خون سے ہاتھ نہ رنگو۔ ساری زندگی یہ رنگ ہاتھ اور دل سے اُترتا نہیں۔اپنی ذات کی عدالت میں صفائی کیسے پیش کرو گے۔ بات تو ٹھیک تھی شیر دل کی۔جو اپنے حلیے اور حرکتوں سے کہیں بھی شیر جیسا نہیں لگتا تھا بلکہ شیر کے نام پہ ایک لمبا سا دھبہ ہی تھا۔مگر بات اُس نے درست کی تھی۔

شہیر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔آنکھیں بند کیے وہ کتنی ہی دیر سوچتا رہا۔کیا اکیلا وہ اِس دُنیا سے ناانصافی ختم کر سکتا ہے۔جواب نفی میں تھا۔ کیا حال ہو گیا تھا۔ایک ہفتے سے لباس تک تبدیل نہیں کیا تھا۔آنکھوں کے گرد حلقے بن گئے تھے۔چہرے کی تازگی مردنی میں بدلتی جاتی تھی۔اِک مایوسی نے اُسے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔تو وہ پھر کیا کرے۔کوئی راستہ نہیں تھا۔بہت دیر وہ ماتھے کو مسلتا رہا۔ڈاکٹر ساجد خان رہ رہ کر یاد آتے۔ اِک بے گناہ کا خون رائیگاں چلا گیا۔ اِک قیمتی شخص کھو گیا۔اِک گوہر نایاب لُٹ گیا تھا۔وہ عملاً یونیورسٹی چھوڑ چکا تھا۔ یونیورسٹی کی رونق میں بھی اِک لمبی چوڑی ویرانی اور تنہائی تھی۔وہ کہاں لے جائے اِس دل کو جو رات دن اُسے کچوکے لگاتا تھا۔بہت سوچنے کے بعد وہ اِک نتیجے پر پہنچ گیا تھا۔اگلے دن وہ فریش ہو کر شیر دل سے ملا۔ہاں باؤ کیا فیصلہ کیا پھر۔شیر دل مجھے وہ بندہ زندہ چاہیے۔مل جائے گا۔کیا!! شہیر نے سوال کیا مل جائے گا باؤ۔ چاہے پاتال کی تہہ میں چھپا ہو۔

ہم پہاڑوں کا کیڑا ہے۔ڈھونڈ لے گا۔تم بتاؤ کیا دو گے اور یوں سودا ہو گیا۔ایک مہینے کا وقت طے ہوا اور

اُسی جگہ پر ملنے کا طے کر کے شہیر واپس اپنے گاؤں لوٹ آیا تھا۔ نہایت ضعیف والدین اُس کی خوشی دیکھنے کی آس میں زندہ تھے مگر وہ تو کسی اور ہی دُنیا کا باشندہ بن چکا تھا۔ اِسی بے قراری میں ایک ہفتہ گذر گیا۔ بوڑھے ماں باپ کی اُسے دن رات سسکیاں سُنائی دیتیں۔ اب تو اُن کے آرام کے دن تھے۔ مجھے اِس دُنیا کا بھی تو کچھ سوچنا ہے۔

اُس نے اپنے ایک قریبی دوست کو فون کیا۔ دونوں ملے۔ بہت سے پہلوؤں پر غور ہوا۔ کام کا کیا کیا جائے۔ سہیل خان نے اچانک خوش ہوتے ہوئے اُسے بتایا کہ اُس کے ابا کے دوست ایک فیکٹری میں اچھے عہدے پر ہیں۔ وہ اُن سے نوکری کی بات کرے گا۔ مگر میرے بھائی مہربانی سے کسی سے پنگا نہ لے لینا۔ یہ سماج سدھارنے کا بھوت جو تیرے سر پر سوار ہے اِس کو اُٹھا کر ایک طرف رکھ دے۔ اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑے گا۔ اِس مرحلے میں کوئی تمہارا ساتھ نہیں دینے والا۔ لہذا چپکے چپکے اپنا کام کیے جاؤ۔ ٹھیک ہے چل تو کوشش کر۔

نوکری مل گئی تھی۔ ہر جگہ لمبی چوڑی ناانصافیاں اور بے ضابطگیاں دیکھ کر اُس کا دل جلتا رہتا۔ دفتری کام تھا مگر افسران کی بے ایمانی اور بدمعاشی اپنے عروج پر تھی۔ دو نمبری سے مال بنانا اور بیچنا۔ پھر ایک دن ایک درخواست مقامی پولیس کو ملی۔ جس میں فیکٹری مالکان کا سارا کچا چھٹا تھا۔ حیرت کی بات تھی پولیس فیکٹری مالکان کو پکڑنے کی بجائے اُس بندے کو ڈھونڈتی رہی جس نے خط لکھا تھا۔ خیر بندہ تو پکڑا نہ جا سکا۔ مگر ایک بات صاف تھی کہ اِس سارے گورکھ دھندے کی ترسیل میں ساری آسانی پولیس پیدا کرتی تھی۔ رشوت کا بازار گرم تھا۔ یا میرے خدا۔ کیا بنے گا پاکستان۔ کچھ نہیں اچانک سہیل خان کی آواز آئی۔ تم اپنا کام کرو اور اپنے ضمیر کو مطمئن رکھو۔ ہر شخص اپنی دوزخ ساتھ لے کر جائے گا۔

نوکری تو ٹھیک تھی مگر شیر دل کا کہیں پتہ نہ چلا۔ تقریباً چھ ماہ گذر گئے۔ وہ پیچ و تاب کھاتا رہا۔ ڈاکٹر ساجد کا خون رائیگاں چلا گیا۔ اچانک اُسے ایک نامعلوم نمبر سے کال موصول ہوئی۔ وہ شیر دل کا بندہ تھا۔ جناب آپ کا کام کرتے ہوئے شیر دل جان کی بازی ہار گیا۔ بولنے والے کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔ غالباً آنسو بھی تھے اُس کی آنکھوں میں۔ میں شاگرد ہوں خان صاحب کا۔ اُنہوں نے بچوں کی طرح پالا تھا۔ وہ رو پڑا۔ ہوا کیا تھا۔ شہیر نے ٹوٹے ہوئے دل سے پوچھا؟

شیر خان، نصیر تک پہنچ گیا تھا۔ چلتن کے پہاڑوں میں جہاں برفیلی ہوائیں چلتی ہیں۔ نصیر کو کسی نے بتا دیا تھا کہ کوئی بندہ تمہاری تلاش میں ہے۔ وہ بدک گیا۔ شیر دل کا سامنا ہونے پر اُس نے اپنی سنگینی شیر دل کے سینے میں اُتار دی۔ شیر دل بھی کم نہیں تھا۔ زخمی شیر دل نے اپنا خنجر اُس کے پیٹ میں اُتار دیا۔ دونوں مر گئے۔ شیر دل بہادر آدمی تھا۔ خیر مجھ سے ملنا تمہاری مدد کروں گا۔ جی خان۔

نصیر کی موت کا سُن کر شہیر کو یوں لگا جیسے کسی نے جلتے ہوئے دل پر برف ڈال دی ہو۔ جب نظام انصاف فیل ہو چکا ہو تو پھر دیگر ذرائع ہی رہ جاتے ہیں۔ جو غیر قانونی تو ہیں مگر انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ اُسے نوکری کرتے ایک سال گذر گیا تھا۔ اُس کے کام سے خوش ہو کر مینیجر نے اپنی بیٹی کی شادی اُس سے کر دی اور شہر میں گھر لے دیا۔ جہاں وہ اپنے ماں باپ کو بھی لے آیا۔ زندگی جیسے سکون میں آ گئی تھی۔ مگر یہاں سانس بھی نہ لے پائے تھے کہ نصیر کے بدمعاش دوستوں نے شہیر کے گھر پر حملہ کر دیا۔ ماں باپ اور بیوی کو بچاتے ہوئے وہ شدید زخمی ہو گیا۔ پولیس کے آنے پر وہ فائرنگ کرتے بھاگ گئے۔ ماں باپ تو ساتھ چھوڑ گئے۔ بیوی کو ٹھیک ہونے میں کافی وقت لگا۔ پولیس نے عجیب طرح سے تنگ کر دیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ شہیر بتائے کہ حملہ آور کون تھے؟

وہ کیا بتاتا۔ نامعلوم ڈاکو اور قاتل تھے۔ یہ تو ایک طرح سے دشمنی کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ زندگی کو پرسکون بنانے کی ہر کوشش ناکام ہوئی جاتی تھی۔ پولیس کو نامعلوم قاتل نہیں مل سکے تھے۔ وہ سب علاقہ غیر میں جا چھپے تھے۔ یہاں کے خان اور رئیس اُنہیں پناہ دیتے۔ اُنہیں تلاش کرنا بے حد مشکل تھا۔ ایک بار پھر شیر دل کے شاگرد بہادر خان سے رابطہ کیا گیا۔ ڈھونڈو۔ میرے بوڑھے ماں باپ کے قاتل ڈھونڈو۔ میں جانتا ہوں وہ نصیر کے ساتھی تھے۔ ایک شخص کی جہالت، کم فہمی اور نالائقی نے کتنے گھر تباہ کر دیئے۔

بیوی شدید زخمی ہو چکی تھی مگر زیادہ زخم تو دل پر لگے تھے۔ روح پر لگے تھے۔ وہ اپنا بچہ کھو چکی تھی۔ اور اب ماں نہیں بن سکتی تھی۔ روزمرہ کا دُکھ جو بھلایا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ ماں باپ کے گھر چلی گئی۔ شہیر اکیلا رہ گیا۔ پھر سے وہ دشت زندگی میں تنہا تھا۔ پھر سے دیوار و در آگ اُگلتے تھے۔ آنکھوں کا پانی بھی اِس آگ کو سرد نہیں کر سکتا تھا۔ برباد عمارت پر اینٹیں کیسے لگاتا۔ دل پر گہرے زخموں کا سایہ تھا۔ بہت عرصہ وہ نوکری پر بھی نہیں گیا۔ مگر کب تک۔ واپس آفس آ گیا۔ ماں باپ کے ساتھ معصوم اور بے گناہ بیوی کی تباہی اُسے رُلاتی تھی۔ بہادر نے ایک دن اُسے بتا دیا کہ وہ قاتل کہاں چھپے ہیں۔

آج پھر عرصہ پہلے لی ہوئی گن اُس کے ہاتھ میں تھی۔ کیا ناانصافی یونہی چلتی رہے گی۔ بہادر کے ساتھ پروگرام بنا کر وہ چلتن کے اُن غاروں میں جا پہنچے جہاں اصغر کے قتل کا بدلہ لینے والے چھپے تھے۔ بہادر کے پاس بھی پستول تھا۔ دونوں وہاں پہنچے اور پھر فائر کھول دیا۔ وہ معصوم آدمی جو ساری زندگی جلتا رہا تھا۔ بلا آخر برفیلی ہواؤں میں اپنے خون میں ڈوب گیا۔ بہادر بے جگری سے لڑا۔ دونوں نے اُن چھ قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔ پولیس کے آنے تک سانسیں باقی تھیں۔ شہیر نے تمام کہانی ایس ایچ او کے سپرد کی۔ اور اپنی روح اُن سرد ہواؤں کے سپرد کر دی۔

نظام انصاف اگر درست ہوتا تو اتنی قیمتی زندگیاں یوں ضائع نہ ہوتیں۔ اِک آخری وصیت تھی۔ مجھے ڈاکٹر ساجد کے ساتھ والی قبر میں دفنایا جائے۔ اِک وہی شخص تو تھا جس نے اُس کے جلتے ہوئے دل پر لفظوں کا مرہم رکھا تھا۔ اُس کے اندر کے باغی کو سدھارا تھا۔ آج وہ پرسکون تھا۔ میں نے ان سب سے انصاف کیا۔ جنہوں نے بے انصافی کی۔ ہر چینل پر ایک ہی سوال تھا۔ کیا انصاف اب یوں حاصل کیا جائے گا؟ شہیر کو قاتل کس نے بنایا۔ نظام عدل نے یا سماج نے؟

بھیڑ سے مڈ بھیڑ

کلیم خارجی/مردان

اس نے تین مرلے کی زمین پہ چھوٹا سا گھر بنا کر دروازے پہ تختی لگوائی۔ اکیلا آدمی، ابراہیم داس، پہلے تو کچھ عرصہ تک لوگ اس کی نام کی تختی پہ لعنت ملامت کرنے آنے لگے۔ پھر لوگوں نے اس پر طنز کرنا شروع کیا۔ ایک دن ایک باریش اور موٹا تازہ آدمی اسکے دروازے پہ کھڑے ہوکر غصے سے للکارتے ہوئے بولا۔ کیا اس بستی میں ہی صرف اکیلا آدمی ہے ہم اور باقی تمام لوگ جانور حیوان یا درندے ہیں۔ یہ آدمی خود کیا ہے۔ اس کا مسلک اور مذہب کیا ہے۔ یہ ابراہیم بھی لکھتا ہے۔ اور داس بھی۔ یہ ہماری بستی کے لیے ایک مذاق بنا ہوا ہے۔ شام گئے جب وہ گھر لوٹا تو اس کی بیوی اور کم سن بچے سہمے ہوئے تھے۔ ڈرپوک بیوی نے اُسے منت کرتے ہوئے کہا۔ یہ تختی اُتار دو۔ ہم نے یہاں رہنا اور بسنا ہے۔ اِنہی لوگوں کے ساتھ ملنا جلنا ہے۔ انہیں مشتعل اور متنفر کر کے ہم ان میں کیسے زندگی گزار پائیں گے۔ بیوی کی حوصلہ شکن باتیں سن کر کے اسے بھی غصہ آنے لگا تو کیا میں اکیلا نہیں۔ کیا اس ملک میں اس زمین پہ زندہ رہنے کے لیے میں اکیلا کوشش نہیں کیے جا رہا ہے۔ کیا تمہیں زندہ کہنے اور تمہاری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے میں اکیلا نہیں ہوں۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے اس کے لیے محنت اور مشقت کرنے میں اکیلا ہی تو تھا۔

جب اکیلے ہوتے ہیں ابو، کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ اسکی آٹھویں جماعت میں پڑھنے والی بیٹی سب سے بڑی نے ڈرتے ڈرتے اپنے باپ کو صحیح سمت سوچنے پہ مائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا وہ حیرت اور ناراضگی سے بیٹی کو گھورتے رہ گیا۔ اور پھر اپنے مزاج ٹھنڈا کرتے ہوئے تحمل سے بولا، بیٹی یہاں کوئی اکیلا نہیں ہے۔ تمہیں اکیلے ہونے کا ابھی پورا مطلب نہیں آتا۔ یہ زمین اتنی پراسرار، خوفناک اور بے رحم ہے کہ یہاں اکیلے زندگی گزارنا اتنا سہل نہیں ہے۔ میری بیٹی لوگ اپنی طرح کے لوگوں کے ساتھ جڑ کر رہتے ہیں۔ لوگ مل کر وارداتیں کرنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ رشتے ناتوں میں بندھ جاتے ہیں یہاں مذہبی، سیاسی کاروباری اور وارداتی گروہ بندیاں ہیں۔ لوگ مفادات تحفظ، لالچ اور خوف کے تحت بڑے بڑے خاندانوں میں آباد رہتے ہیں۔ اور اپنے سے مختلف، اور بے فائدہ، بے ضرر یا شریف آدمیوں کو کوئی حیثیت نہیں دیتے۔ اپنی بات کو پوری انصاف دینے کی بجائے وہ اپنے سامنے رکھے ہوئے کھانے کو چکھے بغیر اُٹھا اور گھر کا دروازہ کھول کر گلی میں باہر نکل گیا۔ لوگوں سے پوچھنے پر اُسے پتہ چلا کہ گلی میں اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے والے حاجی امیر علی نے اسکی عدم موجودگی میں اس کے دروازے پہ جا کر اُسکی بیوی بچوں کو ہراساں کیا ہے۔ حاجی امیر علی کسی سرکاری محکمے سے ریٹائرڈ ہوکر اس گلی میں اپنا مکان تعمیر کروا کے آباد ہوئے تھے۔ انہیں ابھی دو سال ہی ہوئے تھے۔ لیکن وہ اپنی باتوں اور رویوں سے بہت سے لوگوں پہ اس بات کی دھاک بٹھا چکے تھے کہ وہ کسی اعلیٰ عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے تھے اور ان کا تعلق بہت بااثر اور طاقتور خاندان سے ہے۔ دو ہی سال میں اُنہوں نے اپنے نئے گھر میں بہت سی تقریبات منعقد کروا کے گلی کے لوگوں پہ اپنا رُعب قائم کر لیا تھا۔ ابراہیم داس کو اس بات پہ غصہ تھا کہ اس کے مکان کو بنے دس سال ہوگئے۔ تختی بھی دس سال پُرانی تھی۔ شروع کے دو تین سالوں میں وہ پر اعتراض، طنز، مذاق اور نفرت کے کلمات کو سہہ چکا تھا۔ اب بات پرانی، بلکہ بے اہم ہو چکی تھی۔ اُسے آج میرے گھر کے دروازے پہ جا کر اپنا احتجاج دکھانے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ اپنے جذبات اور غصے پہ قابو پاتے ہوئے اُس نے حاجی امیر علی کے دروازے پہ دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک سانولا سا جوان باہر آیا۔ تو اس نے کہا، حاجی امیر علی صاحب سے کہو۔ اکیلا آدمی ابراہیم داس آیا ہے۔

بہت دیر اور تکبر سے حاجی امیر علی برآمد ہوئے۔ اور شکوہ کرتے ہوئے بولے یار ہم اس وقت کسی سے ملتے نہیں۔ جلدی کھانے اور سونے کے عادی ہیں۔ بہرحال فرمایئے وہ کچھ دیر حاجی صاحب کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ اور پھر نہایت سنجیدگی اور دلیری سے بولا، میں چاہتا ہوں کہ اس وقت آپ کے گھر میں جتنے بھی مرد حضرات ہیں۔ باہر آجائیں تو ہم سب کے لیے بہتر ہوگا۔

کیا مطلب! حاجی صاحب تشویش اور رنج سے منہ ٹیڑھا کر کے بولے۔

تا کہ اس بات کا اظہار ہو سکے کہ اس گلی میں اکیلا ہونے کی سچائی اور طاقت صرف میرے پاس ہے۔

آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ حاجی صاحب کا لہجہ ذرا سا نرم ہوا۔

میں صرف آپ کے تمام مرد حضرات کے سامنے مظاہرہ کرنے آیا ہوں۔ اگر آپ میری بات نہ مانے تو میں برسوں یہیں کھڑا رہوں گا۔ اور بار بار دستک دیتا رہوں گا۔ اسکی آواز سُن کر حاجی امیر علی صاحب کے گھر سے تین چار جوان مرد خود بخود باہر آگئے۔ تو وہ فتح اور اعتماد سے بولا، اندر کچھ اور جوان مرد ہوں تو نہیں بھی بلا لیجئے۔

نہیں بس ہم سب ہی موجود تھے۔ تین میرے

بھتیجے ہیں۔ اور دو میرے بیٹے۔ یہ سب لوگ کھانا کھا رہے تھے۔

ٹھیک ہے حاجی صاحب وہ سینہ تان کران کے قریب ہو کر بولا، اب دیکھئے نا۔ میں اکیلا آدمی ہوں کہ نہیں۔ اور پھر یہ بھی جان لیجئے! کہ اکیلا ہونے کی وجہ سے کسی بھی معاملے یا معرکے میں میرا زیادہ نقصان ہونے کا اندیشہ نہیں۔ میں جان ہتھیلی پہ لیے پھرتا ہوں۔ آپ میری عدم موجودگی میں میرے گھر کے دروازے پہ دھمکیاں دینے گئے تھے۔ کہ میں اکیلا آدمی ابراہیم داس کے نام سے جانا پہچانا کیوں جاتا ہوں۔ آپ کو میرے اکیلے آدمی ہونے پہ کیا اعتراض ہے۔ اور آپ مجھے مٹانے کا کیا عمل اختیار کر سکتے ہیں۔ آپ کو میرے اکیلے ہونے، آدمی ہونے اور ابراہیم داس ہونے سے کس طرح کا خطرہ ہے۔

سردی اور اندھیرے میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ حاجی صاحب کا لہجہ تلخ اور بے خوف ہو گیا۔ تو گویا تم میرے دروازے پہ اس لیے آئے ہو کہ مجھے شرمندہ اور خوفزدہ کرسکو۔

جب میں اپنے گھر میں نہیں تھا تو آپ کس لیے میرے دروازے پہ دھونس جمانے گئے تھے۔ میں اکیلا ہوں۔ اور اکیلا تھا۔ اس لیے اکیلا آ گیا ہوں۔ آپ میرے وجود کو اپنی مرضی اور اختیار سے کس قدر تبدیل کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ میں یہ دیکھنے آ گیا ہوں۔ آپ سب مجھ پہ ٹوٹ پڑیں اور مجھے دوبارہ اُٹھنے کے قابل نہ چھوڑیں۔

گونجتی آوازیں سن کر آس پاس گھروں کے دروازے کھلنے لگے۔ اور حاجی امیر علی کے گھر کے آگے مجمع بڑھنے لگا۔ ہجوم کی تعداد اور ابراہیم داس کی دیدہ دلیری دیکھ کر حاجی امیر علی آپے سے باہر ہو گئے۔ اور وہ ابراہیم داس کو دبوچنے کے لیے آگے کی طرف اُچھلے۔ لیکن اُن کے بھتیجے نے انہیں جلدی سے تھام لیا۔ حاجی صاحب کا غصہ بے قابو ہو گیا۔ ان کے منہ سے جھاگ باہر نکلنے لگی تو اُنہوں نے اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کو حکم دیتے ہوئے کہا توڑ دو اس نیچ آدمی کی ساری ہڈیاں اس کا منہ بگاڑ کے رکھ دو۔ یہ مردود یہاں سے صحیح سلامت نہیں جانا چاہیے۔ پھر ایکدم حاجی صاحب کا جسم ڈھلک کر زمین پہ آگرا اور وہ ٹھنڈے فرش پہ دراز ہو گئے۔ خوف اور گھبراہٹ سے ان کے بھتیجوں اور بیٹوں نے ان کے پلپلے اور موٹے وزنی جثے کو بڑی مشکل سے سمیٹ کر اُٹھایا۔ اور ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ انہیں گھر کے اندر لے گئے۔ حاجی صاحب کے ایک بھتیجے نے ابراہیم داس کو للکارتے ہوئے کہا۔ کتے کے بچے کھڑا رہا۔ میں ابھی آتا ہوں۔ لیکن وہ باہر نہ آیا۔ گلی میں ہجوم جمع تھا۔ بہت سے لوگ ابراہیم داس کو اچھی طرح جانتے تھے۔ لیکن ان میں زیادہ تر تماشائی طبیعت کے لوگ تھے۔ ان کے رویوں سے ظاہر تھا کہ وہ نہ تو حاجی امیر علی کے حق میں کھڑے ہونے پر راضی ہیں۔ اور نہ ہی انہیں ابراہیم داس سے کوئی دلچسپی اور ہمدردی ہے۔ ابراہیم داس ان سب کے رویوں اور معاملات سے واقف تھا۔ جب سے اس نے اپنے اکیلے ہونے پہ یقین کرلیا تھا اس کے اندر جرأت، مشاہدے اور مقابلے کی طاقت پیدا ہو چکی تھی۔ لوگ کسی حمایت اور مخالفت کے اظہار کے بغیر معاملہ جاننے کے تجسس میں تھے۔ ابراہیم داس نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے کہا۔

آپ سب جانتے ہیں میں ابراہیم داس ہوں۔ اب میں ہندو سے مسلمان ہوا ہوں اور اس گلی کے آدھے گھر ہم ہندوؤں کے تھے ہم اپنے پناہ دینے مسلمانوں کے احسان کی وجہ سے مسلمان ہو گئے تھے پھر میں نے اگر اکیلا آدمی لکھ رکھا ہے تو کیا اس سے میرے اعلیٰ عہدے، مرتبے، اعزاز طاقت یا اونچی نسل کا اظہار ہوتا ہے میں نے اس لیے یہ تختی لگا رکھی ہے کہ میں اپنی زندگی صحت اور بیوی بچوں کی بقا کے لیے صرف اپنی محنت اور ہمت پر انحصار کرتا ہوں۔ میں اپنے ماضی اور حال کے بارے میں بے خوفی سے دُنیا کو آگاہ رکھنا چاہتا ہوں اس زمین کے لوگ بھی عجیب ہے ایک طرف تو وہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ ان کو ملتا ہے مجھے نہ ملے۔ میں نے یہاں زندگی کے معاملات جتنے لوگوں سے بھی طے کیے ہیں اُن سب کی ایک ہی سوچ اور ایک ہی رویہ تھا کہ میں اُنکے حصے کی عزت، رزق اور نصیب میں حصہ دار نہ بن جاؤں۔ وہ لوگ جن کے اخلاص کی وجہ سے میں مسلمان ہوا تھا وہ دُنیا سے چلے گئے تو میرے حصے میں وہ لوگ آئے جو مجھے ایسا دیکھنا چاہتے تھے جیسا کہ اب میں ہوں لیکن اس کے باوجود کچھ لوگوں کے عقیدوں، رسموں اور معیار کے لیے میں اب بھی ناقابل برداشت ہوں۔ اس دوران تماشائیوں میں سے کسی نے ہلکی سی آواز میں کہا حاجی صاحب کا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا ورنہ آج اُس کے دروازے پر تیرا حلیہ بگڑ جاتا۔ اُس نے اپنے اوپر اس طنز کو برداشت کرتے ہوئے دوبارہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا نہ کسی کا احسان مند ہوں نہ کسی سے خوفزدہ ہوں۔ سردی کی وجہ سے ابراہیم داس کے منہ سے بھاپ کے بادل دیکھ کر آس پاس کھڑے لوگوں کے چہروں پر تمسخر کی ہنسی بکھر گئی لیکن اُسے احساس ہو گیا تھا کہ لوگ اُس کا تماشہ دیکھنے کے منتظر ہیں چنانچہ وہ دروازے سے دُور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ لوگوں کی سوالیہ نظریں اور چہ مگوئیاں سن کر وہ دوبارہ دھاڑا۔

میں اکیلا ہوں جہاں میں مجھے نہ کسی کا انتظار ہے نہ کوئی دوست نہ غم خوار ہیں۔ سب کچھ اکیلے کرنے کا عادی ہوں اور اکیلے مرنے کا ارادہ رکھتا ہوں یہ حاجی صاحب میری عدم موجودگی میں میرے گھر کے دروازے پہ کھڑے ہو کر میری بیوی بچوں کو دھمکیاں دے کر آئے تھے انہیں میرے نام کی تختی سے اپنے متعلق خطرات محسوس ہونے لگے تھے چنانچہ میں یہاں آ گیا ہوں کہ وہ من چاہی واردات سرانجام دے

لے میں نے ان کے تمام مردوں کو بلا کر ان سے کہا کہ میں جیسا ہوں ویسا آ گیا ہوں مٹانے یا تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو شوق پورا کر لے لیکن حاجی صاحب کا اشتعال خود ان کے خون میں سرایت کر گیا ان کا زہر مجھ پہ پڑنے کی بجائے ان کے اپنے جسم میں پھیل گیا۔ حاجی امیر علی صاحب کے گھر کے اندر سے دہشت ناک چیخوں کی آوازیں بلند ہوگئی اور پھر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ جمے ہوئے ہجوم کو دیکھ کر ابراہیم داس بھی وہیں کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد سائرن بجاتی ہوئی ایمبولنس گلی میں داخل ہوئی حاجی صاحب کو اسٹریچر پہ لٹا کر ایمبولنس میں رکھ دیا ایمبولینس روانہ ہوئی تو سنسنی اور شور شرابے کا ماحول سناٹے میں تبدیل ہو گیا سردی اور اوس کی وجہ سے لوگ اپنے گھروں میں داخل ہونے لگے لیکن ابراہیم داس اور کچھ لوگ ابھی تک کھڑے تھے بہت دیر تک کھڑا رہنے کے بعد ابراہیم اپنے گھر جانے کی بجائے ہسپتال کی جانب پیدل روانہ ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے اُسے اپنے گھر جانے کا کہا لیکن وہ قدم آگے بڑھاتے ہوئے بولا حاجی صاحب اور ان کے بچوں کو میری مدد کی ضرورت ہو سکتی ہے لیکن وہ اوس میں بھیگتے ہوئے، رگوں میں اترتی ہوئی سردی اور گلی کے پیلے بلبوں کی روشنی میں ہسپتال کی طرف بڑھے جا رہا تھا جب وہ گلی سے ہسپتال کی طرف جا رہا تھا تو کسی کی طنز بھری آواز اُسکے کانوں سے آ کر ٹکرائی تمہارے ہسپتال جانے سے کیا ہوگا اور تم ہسپتال میں حاجی صاحب کے کسی کام آ بھی گئے تو کیا وہ تمہارے بارے میں اپنی رائے تبدیل کر لیں گے۔ تم حاجی صاحب کو نہیں جانتے وہ اپنے عقیدے اور ایمان کے پکے اور سچے آدمی ہیں۔ حاجی امیر علی اور ان کے گھروں کے آس پاس کے تمام دروازے بند ہو چکے تھے اور ہجوم کی جگہ اوس کے بادل اُڑتے ہوئے نظر گلی میں پھیلتے جا رہے تھے۔

ولی عالم شاہین/کینیڈا

کاڑھتی ہے مخملیں پرچھائیاں آواز سے
حشر رکھتی ہے بپا کچھ یوں وہ ہلکے ساز سے
دل نے کیا کیا روگ پالے جن میں تیرا غم بھی تھا
کام کی چیزیں نکل آتی ہیں خاک انداز سے
کل ابھی گزرا نہ تھا اور آج بھی آیا نہ تھا
بے خبر ہونا بھی ناممکن تھا برگ و ساز سے
جانتے بھی ہیں ہم اپنی قدر و قیمت کچھ نہ کچھ
پھر بھی رہتے ہیں خجل بازار کی آواز سے
ہر ہتھیلی میں ہے اب جمشید کا جامِ جہاں
کون پلکوں پر سے پردوں کو ہٹائے راز سے
رکھ نہیں پاتے کبھی شاہین دنیا کا بھرم
اور کبھی رہتے ہیں اپنے آپ سے ناراض سے

سعید اقبال پسروری/لاہور

نقطہ کیوں اللہ محمد میں نہیں
دور رس نکتہ ہے جو سمجھا دیا
شعر ہے الہام کی صورت سعید
ہم نے جو فرما دیا فرما دیا

....

چپ ہے سعید رُوخ وہ تصویر کی طرح
تصویر سے ہی سلسلۂ گفتگو چلے

....

بدتر ہیں گداؤں سے مری قوم کے لیڈر
کشکول تو بھر جاتا ہے نیت نہیں بھرتی

....

جنت کشمیر میں جینا بھی دوبھر ہو گیا
سانس جس کی چل رہی ہے اسکی جاں خطرے میں ہے

....

سنتے ہیں یہ سوال بھی اٹھے گا حشر میں
آدم بہت سے تھے مگر انسان کون تھا

....

تسبیح کے دانوں پہ ترا نام لکھا ہے
اور نامۂ اعمال کے اندر ہے سیاہی

....

سن رہا ہوں صدا اذانوں کی
کتنا اچھا مرا زمانہ ہے
تیرگی خود ہی بھاگ جائے گی
کام میرا دیے جلانا ہے

تاثیر نقوی/لاہور

دن بدن جو رابطے بڑھنے لگے
یوں لگا ہے فاصلے بڑھنے لگے
ایسے بدلے ہیں تقاضے وقت کے
زخم بھی آہوں میں اب ڈھلنے لگے
اِک خطِ اُلفت جو کھینچا تو لگا
مہرباں مل کر باہم چلنے لگے
زخم اُس کی بے رُخی کے الاماں
اشک آنکھوں سے مری بہنے لگے
یوں لگا خاموش بیٹھا ہے کوئی
خود بخود یہ پیڑ کیوں جلنے لگے
[illegible] یک دم رک گئی
دوست بھی ملتے ہوئے ڈرنے لگے
یہ نہیں معلوم اُن کو کیا ہوا
ایک دوجے سے یونہی جلنے لگے
ہجر کی شب ہے یہاں اور وہ وہاں
فاصلے منزل سے یوں بڑھنے لگے
دیکھنے والی ہے اُن کی یہ ادا
سامنے آ کر غزل پڑھنے لگے
بے حسی کا دور ایسا آ گیا
آدمی کو آدمی ڈسنے لگے
میری صورت پر اُداسی دیکھ کر
کیا ہوا وہ کس لیے ہنسنے لگے
اِس کہانی میں عجب تاثیر تھی
جس کے افسانے یونہی بننے لگے

قفس

فائزہ صابری نوا/ لاہور

ایک تھی چڑیا مٹیالے سے رنگ کی۔ حسین نہ سہی لیکن چڑیا تو بہر حال تھی۔ اسے جب قفس میں لایا گیا تھا تو وہ آنکھوں کا تارا تھی۔ اس کا مالک سو جان سے فدا تھا اس پہ۔ اسے محبت کی توجہ نے سب رنگوں کا ناز اوڑھا دیا تھا۔ اسے لگنے لگا تھا فطرت کے سبھی رنگ اس میں ہی تو ہیں۔ اسے یاد بھی نہ رہا کہ وہ فقط ایک مٹیالی سی چڑیا ہے۔ خیر بہت سا وقت ساتھ بیتا۔۔۔

پھر وقت نے کروٹ بدلی اور مٹیالی چڑیا کے سب رنگ اڑ گئے جو کبھی اس کے تھے ہی نہیں۔ جب اس کے مالک کی آنکھوں کا رنگ بدلا سب بدل گیا۔۔۔ تو وہ فقط مٹیالی رہ گئی۔

مٹیالی چڑیا کو جب راندہ دہلیز کیا گیا تو حیرت بھری آنکھوں سے اس نے مڑ کہ دیکھا اس کے مالک کا چہرہ کتنا بدل گیا تھا!! انجانا سا کتنا کرخت سا۔۔۔ اس نے دیکھا ایک پیاری سی جادو کے رنگ جیسی چڑیا آن موجود ہوئی تھی۔ اس نے سوچا محبت سزا ہے کیا؟؟؟؟

مٹیالی چڑیا نے کھڑکی سے کود جانے میں عافیت جانی۔ کودتے سمے اسے لگا اس کا پر ٹوٹ گیا ہے شائید۔۔۔ لیکن وہ پر نہیں تھا۔ اس کے دل سے ایک قطرہ خون ٹپک گرا تھا۔ اس نے مسکرا کہ اس قطرے کو زمیں بوس ہوتے دیکھا۔ پھر وہ ہری ہری گھاس میں گم گیا تھا کیوں کہ وہ اب اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ یا شائید وہ زیادہ اونچا آ گئی تھی۔

سامنے بہت بڑا باغ تھا خوبصورت گھنے جنگل جیسا۔ اتنا وسیع کہ اسے اپنے مالک کی آنکھیں یاد آ گئیں۔ جب وہ قفس نشیں تھی۔

اس کا من نہیں تھا اڑنے کو۔ وہ ایک بینچ کی ٹیک پہ جا بیٹھی۔ دن گزرتے رہے وہ مٹیالی کہیں نہیں گئی۔

ایک دن ایک شخص ادھر آ نکلا۔۔۔ نیلے رنگ جیسا پرسکون، شفاف، مہربان دل ربا سا۔ مٹیالی اڑ کہ دوسری نکڑ میں بیٹھ گئی۔ وہ مہرباں شخص بینچ پہ بیٹھ کہ ساتھ لائی کتاب میں مصروف رہا۔ حیرت کی بات ہے کہ مٹیالی چڑیا کو وہ اجنبی نہیں لگا۔ اس سے خوف بھی نہیں آیا۔۔۔۔ وہ روز آنے لگا۔ مٹیالی بھی عادی ہو گئی اس کے آنے کی۔ ایک دن وہ اپنے ساتھ سینڈوچ لایا، تب اسے احساس ہوا کہ یہاں ایک اور ذی روح بھی ہے۔۔۔ مٹیالی چڑیا۔

وہ اس سے مسکرایا اور چھوٹا سا ٹکڑا اس کے آگے رکھ دیا۔ مٹیالی نے پاوں بڑھائے اور رزق کو نوش جاں کیا۔

وہ شخص بہت شفیق تھا۔ مٹیالی اب بالکل اس کے پاس بیٹھتی۔ وہ اکثر کچھ لانے لگا کھانے کے لئے شائید مٹیالی چڑیا کی وجہ سے۔ مٹیالی کا غم مدھم پڑنے لگا تھا۔ اب وہ اس کا انتظار کرنے لگی تھی۔ چاہے وہ اس کے لئے رزق لاتا یا نہ لاتا مٹیالی کا انتظار نہ ٹوٹتا۔ وہ اسے دیکھ کہ مسکراتی۔ اپنے تئیں گردن ہلا ہلا کر چونچ اٹھا کر اس سے باتیں کرتی۔ وہ شفیق پیاری آنکھوں والا مہربان اسے راس آنے لگا تھا۔ اس کا غم اب اس سے بہت دور چلا گیا تھا۔ مٹیالی اس کی ٹانگ پہ بیٹھ جاتی اس کے کندھے پہ بیٹھ جاتی۔ وہ مسکراتا اور کتاب پڑھتا رہتا۔ کبھی اس کی چونچ گدگدا دیتا کبھی اس کے سر کو انگلی سے سہلاتا تو مٹیالی کی آنکھ میں آنسو آ جاتے وہ سوچتی کاش میں انسان ہوتی۔ مجھے کسی بد شکل جادوگر نے جادو سے چڑیا بنایا ہو!! کیا معلوم میرے سر پہ کیل لگی ہو جس کو نکالیں تو میں انسان بن جاوں!! وہ مہربان جب بھی اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتا تو وہ اس کا چہرہ غور سے دیکھتی کہ شاید کوئی کیل ہو تو محسوس ہو اس شخص کو؟؟ لیکن کوئی حیرت کا تاثر نہ ابھرتا اس میں اور وہ جان جاتی کی کیل نہیں ہے کہیں بھی۔ مگر وہ یہ تو جانتی تھی کہ وہ ایک مٹیالی چڑیا ہے۔ کوئی زرق برق پروں سے مزین کوئی طائر نہیں ہے جس کے نصیب میں دہلیز لکھی جائے گی۔

احساس ہی تو ہے جو انسان کو بندہ بناتا ہے۔ اور وہ شفیق بندہ بہت حساس تھا نہ جانے کون کون سے احساس جان گیا۔ اس نے مٹیالی کے پاس جانا اسے رزق دینا کم کر دیا۔ مٹیالی ہر حال میں پوری خوشنودی سے رزق کو اپنی جان کا حصہ بناتی۔ وہ اب اتنے پہ بھی راضی تھی۔ وہ جانتی تھی غنیمت کیا ہے!!! اسے زندہ رہنے کو بس تھوڑی سی توجہ تھوڑی سی محبت کی آنچ ہی تو درکار تھی۔

دن گزرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ مہرباں نہیں آتا۔۔۔۔۔ مگر بہت کم۔۔۔ لیکن اب مٹیالی کو یہ بھی غنیمت لگتا ہے کہ وہ آتا ہے۔۔۔ اس کی آنکھوں کا رزق۔۔۔ مٹیالی چڑیا پیڑ سے چپکی رہتی ہے ایک ہی ڈال پہ اور دن ہیں کہ گزرتے رہتے ہیں۔ مٹیالی کے بازو سے قطرہ خون اکثر ٹپک جاتا ہے۔۔۔ زندگی کے کم ہونے کی نشانی۔ لیکن ایک نظر دیکھ کہ اس کا رزق اسے پھر سے توانا کر دیتا ہے۔ وہ پھر سے جی اٹھتی ہے پھر سے مرنے کے لئے۔۔۔

جدید اُردو نظم کی تفہیم اور جواز جعفری

تبصرہ: ڈاکٹر ساحل سلہری

نظموں کے فرداً فرداً مطالعے کا وہ سلسلہ جو میراجی نے شروع کیا تھا آج بھی جاری ہے۔ بلراج کومل کے مرتب کردہ ستیہ پال آنند کی نظموں کے تجزیاتی مطالعے بھی اس سلسلے کا حصہ ہیں کتاب "ستیہ پال آنند کی تیس نظمیں" میں شامل تجزیاتی مطالعے ستیہ پال آنند کی ان تیس نظموں سے متعلق ہیں جو رسائل وجرائد کی زینت بن چکے ہیں۔ ستیہ پال آنند کی نظموں کے تجزیاتی مطالعے ان کی نظموں کے ظاہر و باطن تک پہنچنے کی ایک قابل ستائش کاوش ہے۔ بلراج کومل کی تربیت دی ہوئی یہ کتاب پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز کرشن نگر دہلی سے 2007 میں شائع ہوئی اور باردوم بزم تخلیق ادب پبلشنگ ہاؤس کراچی سے 2013 میں اشاعت پذیر ہوئی۔ جدید اُردو نظم کی جو طرح میراجی نے ڈالی تھی اسے مختلف شعرا اور ناقدین نے آگے بڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً وزیر آغا کی نظموں کے جو مطالعے رقم ہوئے اور جو مختلف رسائل اوراق، کاغذی پیرہن، نردبان، الحمرا، ادب دوست اور ماہ نو میں چھپتے رہے انھیں عابد خورشید نے بڑی محنت سے یک جا کر کے کتابی شکل دی ہے۔ عابد خورشید کی مرتب کردہ کتاب وزیر آغا کی بائیس نظمیں (مطالعات) مکتبہ نردبان سرگودھا سے جنوری 2007 میں شائع ہوئی۔ نظم کی تفہیم و تجزیہ کی روایت میں اضافہ کرتے ہوئے راقم نے جواز شناسی کا در وا کرتے ہوئے پہلا پتھر رکھا۔ راقم کی کتاب "اُردو نظم کے نئے آفاق: ڈاکٹر جواز جعفری ایک مطالعہ" 2021 میں دھنک مطبوعات لاہور سے شائع ہوئی۔ راقم کی یہ کاوش جواز شناسی کی خشت اول ہے۔ ازاں بعد جواز جعفری کی نظم نگاری معاصر شعرا، ادیبوں اور ناقدین کی توجہ حاصل کرنے لگ گئی۔ اُردو نظم کے تجزیاتی مطالعے کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے محمد انیس رزاق نے جواز جعفری کی 35 نظموں کے تجزیاتی مطالعات "اُردو نظم کا ساتواں در" کے نام سے فکشن ہاؤس لاہور سے 2022 میں شائع کیے ہیں۔

محمد انیس رزاق بے حد داد اور حرف تحسین کے سزاوار ہیں کہ انھوں نے "اُردو نظم کا ساتواں در: ڈاکٹر جواز جعفری کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ" شائع کر کے جواز شناسی کی روایت میں اضافہ کر دیا ہے۔ ان کی یہ کاوش ان کے ادبی مذاق، تنقیدی وژن بالخصوص شعری معیار کا اعلامیہ ہے۔ انھوں نے جواز جعفری کی نظموں کے تجزیے مرتب کر کے جواز شناسی کا در وا کیا ہے۔ انھوں نے ایک ایسے نظم نگار کو پذیرائی عطا کی ہے جس (جواز جعفری) نے معاصر نظم کے یکسانیت زدہ لحن سے بیزار ہو کر اساطیری نظم کا آغاز کیا ہے۔ جواز جعفری نے اپنے شعری وفور سے قدیم اساطیری کہانیوں کو revisit بھی کیا ہے اور متعدد نئے اساطیری متون بھی تخلیق کیے ہیں۔ جواز جعفری نے اپنی نظموں میں تہذیب انسانی کو خاص طور سے موضوع بنایا ہے۔ اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر محمد انیس رزاق نے اپنی مرتب کردہ کتاب "اردو نظم کا ساتواں در" کا آغاز ہی ڈاکٹر جواز جعفری کی ایک طویل اساطیری نظم "موت پر غالب آنے کا خواب" کے تجزیاتی مضمون سے کیا ہے۔ تجزیہ نگار غلام حسین ساجد نے جواز جعفری کی سومیری داستان گل گامش کے تناظر میں لکھی گئی نظم کے تینوں حصوں موت پر غالب آنے کا خواب، ہمارے چہرے دلمون کی جانب تھے اور موت ہمارے سر پر منڈلا رہی تھی کا مفصل تجزیہ پیش کیا ہے۔ غلام حسین ساجد کے بقول نظم کے آہنگ میں اساطیری رس اس روانی سے دوڑتا ہے کہ اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ ڈاکٹر ناصر بلوچ نے جواز جعفری کی یونانی ہیرو پرسیس کی اساطیری کہانی کے پس منظر میں کہی گئی نظم پر عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ جواز جعفری کی اساطیری نظموں پر دیگر لکھنے والوں میں حسین مجروح، اسلم طارق، ظفر منصور، ڈاکٹر صائمہ سلیم اور حسن عباسی شامل ہیں۔ ظفر منصور نے جواز جعفری کی فکر، تکنیک، لسانی گرفت اور پیرایہ اظہار پر بات کی ہے۔ جواز کی نظم میں کائناتی حسن اور انسانی فطرت کی کیفیات مربوط ہو گئی ہیں۔ علاوہ ازیں انسان، [illegible] ازلی شر، [illegible] حیاتیاتی، ارتقا، سائنسی شعور، کائناتی شعور، امن کے لیے ارر جنگ مخالف جیسے موضوعات پر لکھی گئی نظموں پر گراں قدر تجزیاتی مطالعے شامل ہیں۔ تمام تجزیہ نگاروں نے جواز جعفری کی نظموں کی فکری و معنوی سطوح اور فنی وسعتوں کو نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر

عاصم بخاری"، وزیر آغا، سعادت سعید، علی محمد فرشی، نصیر احمد ناصر، رفیق سندیلوی اور دیگر احباب خون جگر سے نظم کی آبیاری میں محو نظر آتے ہیں مگر جو مقام اساطیری، کائناتی اور جنگ مخالف نظموں کے نمائندہ شاعر ڈاکٹر جواز جعفری کے حصے میں آیا ہے اس کی عہد جدید میں مثال نہیں ملتی۔" کتاب میں شامل محمد اکرم سعید کا جواز جعفری کی نظم کا فکری مطالعہ بھی اہم ہے۔ انھوں نے ہتھیاروں کی نسبت دل بناتی، ہتھیاروں سے نفرت کرتی اور امن کے گیتوں کے متن تخلیق کرنے والی نظم "میں دشمن سے محبت کر سکتا ہوں" کا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ انسانی زندگی کے خاتمے کے لیے ہتھیار بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ انسان تو ویسے بھی فانی ہے اور آج کا انسان طاقت کے نشے میں محض اقتصادی فائدے کے لیے حب وطن کے نام پر ایک فانی کو فنا کرنے کے لیے ہتھیار بنانے میں مصروف ہے۔ محمد اکرم سعید نے جواز جعفری کو پیار، محبت، امن اور زندگی کے گیت گاتا شاعر قرار دیا ہے۔ جواز جعفری کی نظمیں محبت کا گیت، امن اور آسودہ زندگی کا پیغام ہیں۔ جواز جعفری پرامن اور خوشحال معاشرے کا خواب آنکھوں میں لیے متبادل دنیا کا خواب دیکھتا ہے۔ شہزاد نیر نے بھی امن کا امکان وا کرتی ہوئی نظم ''میرا عقیدہ تشکیک کی زد پر ہے'' پر ایک عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ شہزاد نیر کا یہ اختصاص ہے کہ وہ جب نثر لکھتے ہیں تو اس میں بھی جملوں کی نشست و برخاست، بنت، لفظوں کے انتخاب و تخلیق میں بھی شعریت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ بقول شہزاد نیر عالمی اقتصادی استحصالی قوتوں نے ہماری معاشی آزادی چھین کر ایک تشکیک زدہ عقیدہ ہمارے پاس رہنے دیا ہے۔ امن کو عزیز رکھنے اور خون ریزی کو برا ماننے والا انسان عجیب تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ تذبذب جسے جواز جعفری نے "تشکیک" کے نہایت مناسب لفظ سے نشان زد کیا ہے۔ جواز جعفری کی جنگ مخالف اور امن کا پیغام دیتی ہوئی نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے شہزاد نیر نے اپنے مقالے میں ساحر لدھیانوی کی ایک جنگ مخالف نظم کا حوالہ بھی دیا ہے جس سے جواز جعفری کے بیانیے کی کو تقویت ملتی ہے۔ ڈاکٹر احتشام علی کا تجزیہ بھی "متبادل دنیا کا خواب" کی ایک جنگ مخالف نظم پر مشتمل ہے۔ انگریزی چونکہ بین الاقوامی رابطے کا ذریعہ ہے اس ضمن میں کتاب کے آخر میں جواز جعفری کی نظم "میں نے ترکے میں آنسو پائے" پر ڈاکٹر امجد پرویز کا انگریزی زبان میں لکھا گیا مضمون بے حد اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس سے عالمی سطح پر جواز شناسی کا ورود ہوگا۔ "اُردو نظم کا ساتواں در" دراصل اسی روایت کا ایک اور در ہے جو میراجی نے شروع کی۔

اس کتاب میں ایک ہی شاعر کی 35 نظموں کے تجزیے شائع ہوئے ہیں۔ میراجی نے جو روایت "اس نظم میں" شروع کی اس میں مختلف نظم نگاروں کی مختلف نظموں کے انتخاب اور تجزیے شائع ہوئے ہیں لیکن محمد انیس رزاق کی اس کتاب کا اختصاص یہ ہے کہ اس میں ایک ہی شاعر کی نظموں پر تجزیاتی مضامین شامل ہیں۔ اردو تحقیق و تجزیہ کی روایت میں یہ اپنی نوعیت کا اہم کام ہے۔ اس پر محمد انیس رزاق کو مبارک

❀❀❀

یادوں کے جزیرے

تبصرہ نگار: انیسہ عائش/

کتاب ''یادوں کے جزیرے'' مجموعی طور پر تین حصوں پر مشتمل ہے۔

(1) تاشقند (2) میرا شہر (3) امریکیات

امریکیات دلچسپ معلوماتی حصہ ہے۔ جبکہ ''میرا شہر'' اپنے شہر، اپنی سرزمین سے محبت کی داستان ہے۔ خصوصی طور پر اپنے شہر سے محبت بڑھاتا ہوا ہے، کیونکہ ہم خود کوٹ رادھا کشن کے رہائشی ہیں۔ اپنے شہر سے محبت ہونا ایک فطری سا عمل ہے مگر باوجود کوشش کہ پہلی بار اپنے شہر کوٹ رادھا کشن پر کچھ پڑھنے کا موقع ملا۔ کتاب کا سب سے پہلا اور خوبصورت حصہ ہمیں ''تاشقند'' لگا۔ اس حصے میں مصنف نے کچھ اس مہارت سے منظر نگاری کی ہے گویا ہمارا ہاتھ تھام کر تاشقند لے جا پہنچایا۔ تاشقند کو پڑھتے ہوئے حقیقتا ہم نے خود کو وہاں کے دریاؤں، سڑکوں اور پھولوں کے درمیان گھرا محسوس کیا۔ ازبکستان کے سحر نے ہمیں یوں مسحور کیا کہ جب بھی ہم خود کو بے زار سا محسوس کرتے تو ان اوراق کو کھول کر بیٹھ جاتے۔ انہیں پڑھتے ہی منٹوں میں بیزاری دور ہو جاتی اور بشاشت محسوس ہوتی۔ الغرض اتنی جامع، دلکش پیراہن اور خوبصورت طبع کتاب کے مصنف ہونے پر آپ کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ہمیں بذات خود سیر و سیاحت اور ثقافتی شوق رکھنے کی وجہ سے سفر اور سفرنامے پڑھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ خواہش ہے کہ ہم آپ کے ہاتھوں لکھے ہوئے دیگر سفرنامے بھی پڑھ پائیں۔ مزید برآں اپنے تجربات اور قلمی سفر کی روشنی میں ہم جیسے نو آموز لکھاری کو سیکھنے کا موقع ملے گا۔

ادبی خبریں

✦ نجم فیلوز اور بار ایسوسی ایشن میاں چنوں نے عامر بن علی کے انگریزی سفرنامے Sakura & Spice A Pakistanis journey through Japan کی تقریب رونمائی کا اہتمام کیا۔ یہ تقریب 22 دسمبر کی شام بار روم ہال، بار ایسوسی ایشن میاں چنوں میں ہوئی۔ جس میں کتاب اور صاحب کتاب کے حوالے سے ناقدین فن نے بھرپور اظہارِ خیال کیا اور اس سفرنامے کو نہایت منفرد اور اہم قرار دیا۔ اس موقع پر ایک عظیم الشان مشاعرے کا اہتمام بھی کیا گیا جس کی صدارت مقبول شاعر ندیم بھابہ نے کی۔ وطن عزیز کے نامور شعرائے کرام اس مشاعرے میں شریک ہوئے۔

✦ یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی (یوایم ٹی) لاہور کی ''ادبی بیٹھک'' کے زیر اہتمام معروف محقق اور مزاح نگار ڈاکٹر عارفہ صبح خان کی شگفتہ کتاب ''گنجے اور گنجیاں'' اور سنجیدہ کتاب ''تنقیدی گرہیں'' کی تقریب رونمائی منعقد کی گئی جس میں سجاد میر، ڈاکٹر سعادت سعید، آمنہ اُلفت، گل خیز اختر، ڈاکٹر مختار عزمی، اختر عباس اور عدیل برکی نے اظہارِ خیال کیا۔

✦ اتوار 15 دسمبر کی شام پاک ٹی ہاؤس میں حلقہ اربابِ ذوق لاہور کا ہفتہ وار تنقیدی اجلاس اسلام آباد سے تشریف لائے ہوئے مہمان شاعر عابد سیال کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ ڈاکٹر جواز جعفری نے فنونِ لطیفہ کے حوالے سے نہایت خوب صورت اور جامع مضمون ''متبادل دنیا تک جانے کے راستے'' اور زاہد ہما شاہ نے پنجابی غزل تنقید کے لیے پیش کی۔ مضمون اور غزل پر نہایت عمدہ گفتگو ہوئی۔ اجلاس کے آخر میں امریکہ سے آئے ہوئے مہمان شاعر ڈاکٹر شمیم آزر اور کھاریاں سے آئے مہمان شاعر ارشد شاہین نے اپنا کلام سنایا جسے بہت پسند کیا گیا۔

✦ 13 دسمبر بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں جناب اسلم انصاری کے حوالے سے تعزیتی ریفرنس کا اجلاس منعقد ہوا۔ صاحبانِ علم و دانش کی طرف سے ان کی علمی و ادبی خدمات کو شاندار خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ اس موقع پر مختلف تجاویز بھی سامنے آئیں شعبہ اردو میں ڈاکٹر اسلم انصاری چیئر اور ان کے گھر کے اسٹڈی روم کو یادگار بنانے کی تجویز کی سب نے تائید کی۔

✦ سترہویں عالمی اردو کانفرنس 2024ء جشن کراچی کے سلسلے میں عالمی مشاعرہ Y.M.C.A لان کراچی میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت جناب افتخار عارف نے کی۔ مشاعرے میں شرکت کرنے والوں میں پیرزادہ قاسم رضا صدیقی، حمیرا رحمان، عباس تابش، فواد حسن فواد، جاوید صبا، حمیدہ شاہین، فراست رضوی، احمد مبارک، خالد عرفان، قمر رضا شہزاد، محبوب ظفر، حارث خلیق، وصی شاہ، عقیل دانش، شکیل جاذب، غضنفر ہاشمی، باسط جلیلی، رحمٰن فارس اور عمران عاصی کے نام نمایاں ہیں۔

✦ بزمِ راحتِ سخن، خیالِ نو اور عروسِ سخن کے زیر اہتمام دیوانِ سلمان فارسی حالی روڈ گلبرگ میں میر انیس کے 150 ویں یومِ وفات پر کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔ جناب عادل مختیار، جناب پروفیسر جوہر عباس، جناب عابد مرتضیٰ لکھنوی، مولانا ارتضیٰ عباس نقوی، محترمہ تسنیم عابدی اور ڈاکٹر ہلال نقوی نے مقالات پیش کیے۔

✦ بزمِ چغتائی لاہور کا ماہانہ مشاعرہ غلام حسین ساجد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مہمانانِ خصوصی توقیر احمد شریفی، شاہد رضا، عدنان خالد، فرہاد ترابی اور سید تجمل کاظمی تھے۔ اس مشاعرے میں لاہور کے معتبر اور ممتاز شعراء نے اپنا کلام پیش کیا اور بھرپور داد سمیٹی۔ اس موقع پر صاحب صدر کی سالگرہ کا کیک بھی کاٹا گیا۔

✦ بزم ادب اسلام آباد اور پاکستان لٹریری فورم کے زیر اہتمام اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کے تعاون سے محفلِ مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر جلیل نے کی۔ مہمانانِ خصوصی جناب منظر نقوی اور ڈاکٹر شفیق آصف تھے۔ جبکہ ڈاکٹر شہباز امر رانجھا اور ڈاکٹر نصیر احمد اسد مہمانانِ اعزاز تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شیر علی نے سرانجام دیے۔ مشاعرے میں مدعو شعرائے کرام نے کلام سنایا اور بھرپور داد سمیٹی۔

✦ حلقہ اربابِ ذوق راولپنڈی کے زیر اہتمام ڈاکٹر مہناز انجم کے نظموں پر مبنی شعری مجموعے ''ریشمی خوابوں کی نیلی راکھ'' کا تجزیاتی مطالعہ کے عنوان سے ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت جلیل عالی نے کی۔ کتاب کے حوالے سے ڈاکٹر یٰسین آفاقی، پروین طاہر، ڈاکٹر ابرار عمر، الیاس بابر اعوان اور فرزند علی ہاشمی نے گفتگو کی۔

✦ ساہیوال آرٹس کونسل بہ اشتراک گورنمنٹ کالج ساہیوال علمی و ادبی کانفرنس 2024ء کے سلسلے میں کل پنجاب مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت سید ریاض حسین زیدی نے کی۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر سعادت سعید تھے۔ جبکہ مہمانانِ اعزاز محمد اکرم ناصر، ڈاکٹر طارق ہاشمی، ڈاکٹر اشرف کمال، میجر اعظم کمال۔ یہ مشاعرہ زیر سرپرستی ڈاکٹر ممتاز احمد (پرنسپل) منعقد ہوا۔ منتظم ڈاکٹر محمد افتخار شفیع تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ندیم عباس اشرف نے ادا کیے۔

CamScanner

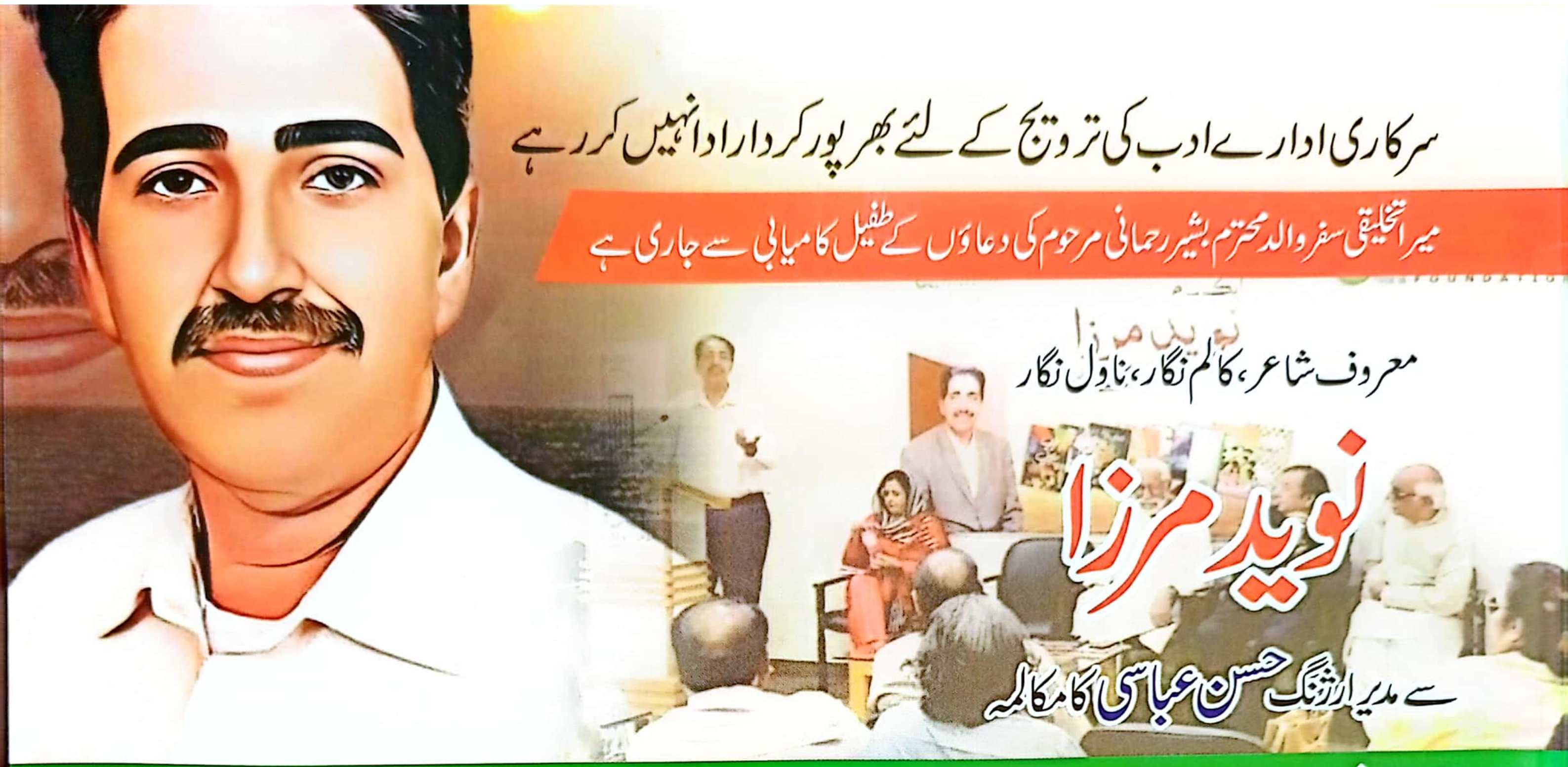

سرکاری ادارے ادب کی ترویج کے لئے بھرپور کردار ادا نہیں کر رہے

میرا تخلیقی سفر والد محترم بشیر رحمانی مرحوم کی دعاؤں کے طفیل کامیابی سے جاری ہے

معروف شاعر، کالم نگار، ناول نگار

نوید مرزا

سے مدیر ارژنگ حسن عباسی کا مکالمہ

پاکستانی ادب اور معاشرے میں مشاعروں کے ہائی جیکر شعراء سے جان چھڑانا مشکل ہے

محمد نوید مرزا ملک کے معروف شاعر، ادیب اور کالم نگار کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی ایک پہچان بچوں کے ادیب کے طور پر بھی ہے۔ محمد نوید مرزا کی مختلف موضوعات پر اب تک 32 کتب شائع ہو چکی ہیں اور دس کتابیں زیرِ ترتیب ہیں۔ نوید مرزا ادب کے ساتھ صحافت سے بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ معروف ادبی جریدے ماہنامہ ''ادبِ لطیف'' کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ سابق مدیر معاون ''اردو سائنس میگزین'' بھی رہے ہیں۔ نوید مرزا ہفت روزہ ''فیملی میگزین'' کے مقبول سلسلے ''سچی کہانیاں'' کی ادارت بھی کر چکے ہیں۔ نوید مرزا کے والد بشیر رحمانی (مرحوم) ملک کے مشہور شاعر تھے۔

س اصنافِ ادب میں کس صنف کو آپ مستقبل کی صنف قرار دیں گے؟

ج اصنافِ ادب میں شعری و نثری دونوں طرح کی تخلیقات ہوتی ہیں۔ شاعری کے حوالے سے دیکھا جائے تو غزل ہر دور میں مقبول رہی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں غزلیہ شاعری کو ہمیشہ عروج حاصل رہا ہے۔ لہٰذا شاعری میں تو غزل ہی مستقبل کی اہم صنف ہے۔ تاہم نثر نگاری میں مختصر افسانے کو مستقبل کی مقبول صنف کے طور پر دیکھ رہا ہوں۔

س ایک اچھی اور معیاری تخلیق کے لیے کن عوامل کا ہونا ضروری ہے؟

ج ایک اچھی اور معیاری تخلیق کے لیے اُس میں خیال آفرینی، در و بست اور تخلیقی ہنرمندی یا کرافٹ مین شپ کا کارفرما ہونا ضروری ہے۔ غزل میں دونوں مصرعوں میں ربط اور نظم میں ایک مکمل خیال اور فنِ شاعری پر دسترس ضروری ہے۔ اگر کوئی نثر پارہ ہے تو اس میں مضبوط فکری نظام اور خیال کا ہونا لازمی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مطالعہ کتب بھی ایک فنکار کو تخلیقی بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ یوں ایک اچھی اور معیاری تخلیق منظرِ عام پر آ گئی ہے۔

س ایک ادیب کی ادبی اور معاشرتی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ کیا پاکستانی ادیب اس کو نبھا رہا ہے؟

ج ایک شاعر اور ادیب کی ذمہ داری ہے کہ وہ جو کچھ تخلیق کرے اُس میں نہ صرف معاشرے کی اصلاح کا پہلو ہو بلکہ نئی نسل کی رہنمائی بھی ہو سکے۔ ادیب کا ایک نیا نظریہ فکر ہونا چاہیے۔ ایک ادیب یا شاعر کو اپنی تخلیقات کے ذریعے معاشرے میں مثبت تبدیلیاں لانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اچھا ادب ذہنوں کی پرورش کرتا ہے۔ ماضی میں پاکستانی ادیب یا شاعر اس فرض کو نبھا رہے تھے مگر آج کل اس میں خاصی کمی نظر آ رہی ہے۔

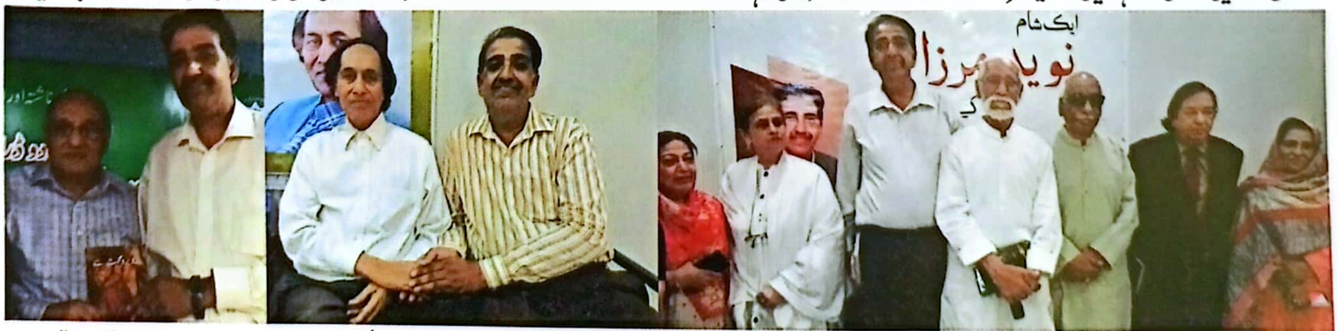

بقیہ اندرونی صفحات پر

QASIM ALI SHAH FOUNDATION کے زیرِ اہتمام

نامور کالم نویس، شاعرہ، ادیبہ اور دانشور **صوفیہ بیدار** کے مقبول اور منفرد افسانوی مجموعے **رنگریز** کی

تقریبِ پذیرائی کی تصویری جھلکیاں

نظامت: ڈاکٹر عائشہ عظیم

عامر بن علی، ڈاکٹر وحید الرحمٰن، ڈاکٹر فخر الحق نوری، صوفیہ بیدار اور رضا رومی

صدارت: ڈاکٹر فخر الحق نوری

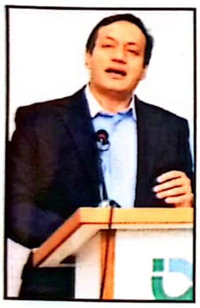

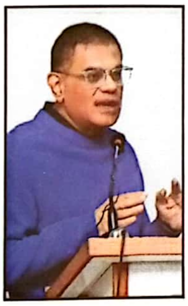
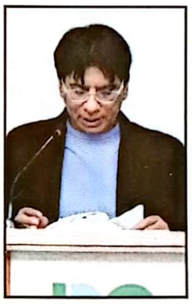

شبیر حسن نے نظم پیش کی، ڈاکٹر عمارہ طارق، ڈاکٹر وحید الرحمٰن، رضا رومی، گل نوخیز اختر، محمد فہد اور عامر بن علی نے کتاب کے حوالے سے اظہارِ خیال کیا

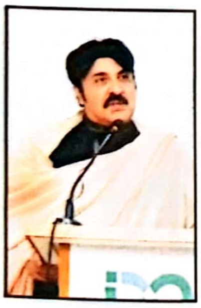

بلقیس ریاض، صائمہ آفتاب، یاسر شمعون اور عدیل برکی کی خصوصی شرکت

تقریب کے بعد شرکاء کا گروپ فوٹو

FEEL FREE TO READ ONLINE
www.amirbinali.com

براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

Read Arzang online
www.amirbinali.com
www.millat.com